انتظار حسین کے ناولوں میں تقسیم ہند کے اثرات اور ہجرت کا کرب

مقالہ برائے ایم۔فل (اُردو)

مقالہ نگار

محمد یاسر

رجسٹریشن نمبر 20HUHL08

نگراں

ڈاکٹر محمد زاہد الحق

شعبۂ اُردو اسکول آف ہیومینٹیز، یونی ورسٹی آف حیدرآباد۔۵۰۰۰۴۶

(۲۰۲۲ء)

UNIVERSITY OF HYDERABAD

“Intizar Hussain Ke Novelon Mein Taqseem e Hind Ke Asrat aur Hijrat Ka Karb”

Thesis submitted to the University of Hyderabad in partial fulfillment of the requirements for the award of the degree of Master of Philosophy
in
URDU

by
Mohd. Yassar
Reg. No. 20HUHL08

supervisor
Dr Md. Zahidul Haque

Department of Urdu
School of Humanities, University of Hyderabad,
Hyderabad – 500046 (Telangana)
2022

ترتیبِ ابواب

پیش لفظ ____ i-iii

باب اوّل : انتظار حسین......ایک تعارفی گوشہ ________________________ 1-43

(الف) سوانحی خاکہ

(ب) ادبی خدمات انعامات واعزازات

(ج) تخلیقی انفرادیت

باب دوم : انتظار حسین کے معاصر ناول نگار............ایک عمومی جائزہ __________ 44-83

(الف) شوکت صدیقی عبداللہ حسین

(ب) قرۃ العین حیدر خدیجہ مستور

(ج) رامانند ساگر رام لعل جوگندر پال

(د) قدرت اللہ شہاب اسلم فرخی

باب سوم : انتظار حسین کے ناولوں میں تقسیمِ ہند کے اثرات اور ہجرت کا کرب _____ 84-165

(الف) ناول ''چاند گہن'' ۱۹۵۳ء کے حوالے سے

(ب) ناول ''بستی'' ۱۹۸۰ء کے حوالے سے

(ج) ناول ''تذکرہ'' ۱۹۸۷ء کے حوالے سے

(د) ناول ''آگے سمندر ہے'' ۱۹۹۵ء کے حوالے سے

حاصلِ مطالعہ ____________________________________ 166-170

کتابیات ____________________________________ 171-172

پیش لفظ

تقسیم اور ہجرت ملکِ ہندستان کی اپنی مخصوص تاریخی و تہذیبی صورت حال اور فکری تناظر کی پیدا کردہ تھی ،جس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انگریزوں نے تقسیمِ ہند کی تحریک کے فروغ کو ممکن بنایا اور ردِ عمل کے طور پر تباہ کن صورت حال پیدا ہوئی۔ یہ ایسا پرآشوب دور تھا جب پورے برِصغیر میں قتل و غارت گری اور لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔عصمت وعفت کے محافظ محض مذہب کی بنیاد پر اسے داغدار کررہے تھے،کل تک شانہ بہ شانہ جنگِ آزادی کی تحریک میں بھرپور حصہ لینے والے افراد،ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے ۔اشرف المخلوقات کا شرف رکھنے والوں کی اس بربریت اور حیوانیت نما سلوک نے حساس ادیبوں کا سر شرم سے جھکا دیا اور آنکھیں خون کے آنسو رونے لگیں۔ ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کے اس میل ملاپ کو جسے صوفی سنتوں اور گروؤں نے باہمی اشتراک سے قائم کیا تھااور وہ گنگا جمنی تہذیب جو نا قابلِ تنسیخ سمجھی جاتی تھی ، پارہ پارہ ہورہی تھی۔ادیب وفنکار اس انسانی اور تہذیبی بکھراؤ پر سب سے زیادہ بے چین اور مضطرب ہو گئے اور انھوں نے اردو اور ہندی میں متعدد ناول اس المناک موضوع کے مختلف پہلوؤں پر لکھ ڈالے تاکہ عوام ٹھنڈے دل ودماغ سے اس صورت حال کے نتائج کو محسوس کرسکیں۔ہجرت کا ذاتی تجربہ رکھنے والے انتظار حسین بھی ان نمائندہ ادیبوں کی فہرست میں شامل ہیں۔

ہندستان کی تاریخ کے اس اہم موڑ پر انسانی شعور نے جو سنگین اور لرزہ خیز تجربہ حاصل کیا ،اسے نظر انداز کرنا ادیبوں کے لیے ممکن نہیں تھا۔اسی صورت حال سے متاثر ہوکر راقم نے بھی تقسیمِ ہند اور ہجرت کے موضوع کا انتخاب کیا۔راقم نے اپنے تحقیقی مقالے بہ عنوان'' انتظار حسین کے ناولوں میں تقسیمِ ہند کے اثرات اور ہجرت کا کرب'' کو اپنے کرم فرمانگراں ڈاکٹر محمد زاہد الحق کے مشورے سے تین ابواب میں منقسم کیا ہے۔

مقالے کا پہلا باب'' انتظار حسین ۔۔ایک تعارفی گوشہ'' کے نام سے ہے، جو تین ذیلی ابواب(

الف)سوانحی خاکہ(ب)ادبی خدمات، انعامات و اعزازات اور (ج)تخلیقی انفرادیت پر مشتمل ہے۔اس باب میں ان تمام گوشوں پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔

دوسرا باب ''انتظار حسین کے معاصر ناول نگار۔۔ایک عمومی جائزہ'' کے نام سے ہے جس کو چار ذیلی ابواب میں منقسم کیا گیا ہے۔اس باب میں موصوف کے ان نمائندہ معاصر ناول نگاروں کا عمومی جائزہ لیا گیا ہے جو ہجرت کا ذاتی تجربہ رکھتے ہیں یا پھر نئے ملک پاکستان کے مسائل سے بہ خوبی واقف ہیں۔انتظار حسین کے ان معاصرین میں شوکت صدیقی ، عبداللہ حسین ،قرۃ العین حیدر،خدیجہ مستور،رامانند ساگر،رام لعل، جوگندر پال ،قدرت اللہ شہاب اور اسلم فرخی شامل ہیں۔

مقالے کا تیسرا اور آخری باب ''انتظار حسین کے ناولوں میں تقسیمِ ہند کے اثرات اور ہجرت کا کرب'' کے عنوان سے ہے۔راقم نے مقالے کے اس اہم باب کو چار ذیلی ابواب میں منقسم کیا ہے۔انتظار حسین کے تخلیق کردہ چاروں ناول ''چاند گہن'' ۱۹۶۵ء، ''بستی'' ۱۹۸۰ء، ''تذکرہ'' ۱۹۸۷ء اور ''آگے سمندر ہے'' ۱۹۹۵ء میں تقسیمِ ہند اور ہجرت کی صعوبتوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ مذکورہ ناولوں کے متن سے لی گئی اس نوعیت کی عبارتیں جا بہ جا مقالے کی زینت بنی ہوئی ہیں۔

اس کے بعد حاصلِ مطالعہ میں اس تفصیلی مطالعے کی اہمیت وافادیت کو اجاگر کرتے ہوئے انتظار حسین اوران کے ناولوں کے غالب موضوع تقسیمِ ہند اور ہجرت کے مقام ومرتبے کو متعین کیا گیا ہے۔یہ مقالے کا مختصر مگر اہم جزو ہے جو پورے مقالے کا احاطہ کرتا ہے۔حاصلِ مطالعہ کے بعد کتابیات شامل ہے جس میں ان کتب و رسائل کا ذکر کیا گیا ہے جن سے مقالے کی ترتیب وتشکیل کے دوران استفادہ کیا گیا ہے۔

اس مقالے کی تکمیل کے لیے سب سے پہلے میں اپنے نگراں اور کرم فرما استادِ محترم جناب ڈاکٹر محمد زاہدالحق صاحب کا بے حد ممنون ہوں جن کی سرپرستی میں یہ مقالہ لکھا گیا۔استادِ مکرم نے اپنے قیمتی وقت میں سے موقع نکال کر میری ہر ممکن رہنمائی اور حوصلہ افزائی کی۔شعبہ اردو یونی ورسٹی آف حیدرآباد کے دیگر اساتذہ کا شکریہ ادا کرنا بھی اپنا فرض سمجھتا ہوں جن سے میں نے کسبِ فیض کیا ہے۔

راقم شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالر برادر صفدر علی کا بھی شکر گزار ہے جنھوں نے انتخابِ موضوع اور دورانِ تحقیق گا ہے گا ہے اپنے نیک مشوروں سے نوازا۔ڈاکٹر آسیہ بیگم لکچرر گورنمٹ ڈگری کالج بٹوت، (یونی ورسٹی آف جموں) کا بھی ممنون ہوں جنھوں نے موضوعِ مقالہ کے بعض اہم نکات کو آشکار کیا۔مواد کی فراہمی کے سلسلے میں راقم ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس ،نئی دہلی اور آسین پبلشنگ ہاوس دلی کا بھی شکر گزار ہے جن کے تعاون کی وجہ سے مقالے کی تکمیل کے سلسلے میں درکار مواد حاصل کرنے میں مجھے کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

میں اپنے والدِ ماجد جناب غلام محمد ،اپنی والدَہ ماجِدہ فرضہ بیگم اور عزیز از جان بھائیوں جناب فاروق احمد (اسکول ٹیچر)،محمد عارف اور قاری ابرار احمد سب کا سراپا سپاس گزار ہوں جنھوں نے مجھے اپنے پیار، خلوص و محبت ،دعاؤں اور شفقتوں کے حصار میں رکھا۔اس کے علاوہ راقم اپنے عزیز دوست آصف جاوید، یوسف جاوید، اشتیاق احمد، فیاض احمد،عشرت حسین ،اعجاز احمد، جہانگیر روش،شبیر احمد اور ونود کمار کا تہہ دل سے شکر گزار ہے جن کی بےلوث محبتیں میرا سرمایۂ حیات ہیں۔شکر یہ کرنا تو محض روایتی ہے،میرے دل میں اس تعاون کی قدر احساس سے کہیں زیادہ ہے۔

محمد یاسر
ریسرچ اسکالر
شعبہ اردو، یونی ورسٹی آف حیدر آباد

﴿ باب ۔ اوّل ﴾

انتظار حسین ......ایک تعارفی گوشہ

(الف) سوانحی خاکہ

(ب) ادبی خدمات، انعامات و اعزازات

(ج) تخلیقی انفرادیت

(الف) سوانحی خاکہ

تاریخِ وِلادت اور نام :

انتظار حسین ایسے فن کار ہیں جن کی زندگی ان کے ناولوں اور افسانوں کی طرح ہی پر اسرار نظر آتی ہے۔ انھوں نے کبھی اپنی زندگی کے سلسلے میں کھل کر کوئی گفتگو نہیں کی۔ اگر کی بھی ہے تو ان کی باتوں سے کچھ کھلنے کے بجائے، بھید اور گہرا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک ان کی زندگی کی کوئی مبسوط تاریخ مرتب نہیں کی جا سکی۔ البتہ اپنی آخری عمر میں انھوں نے خودنوشت ''جستجو کیا ہے'' کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ اس کتاب سے ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی تو پڑتی ہے مگر اس سے ان کی زندگی کی مکمل سوانح تیار کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اس کتاب میں کہیں بھی کسی تاریخ یا دن کے حوالے سے کوئی گفتگو نہیں کی ہے۔ تاریخوں کے سلسلے میں جب بھی ان سے کوئی سوال کیا گیا، انھوں نے اپنی یادداشت کا بہانہ بنایا اور کسی واقعے کا ذکر کر دیا مگر واقعے کے وقت ان کی عمر کیا تھی اس کی وضاحت نہیں کی۔ ایسا اکثر ان کے انٹرویو میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ عمر میمن کے ایک سیدھے سے سوال ''انتظار صاحب آپ کب اور کہاں پیدا ہوئے'' کے جواب میں انتظار حسین کہتے ہیں:

> ''عمر میمن صاحب، یہ بتانا میرے لیے کسی قدر مشکل ہے کہ
> میں کب پیدا ہوا؟
> ؎ کب سے ہوں کیا بتاؤں جہان خراب میں
> البتہ جہاں پیدا ہوا، اس بستی کا نام ڈبائی تھا۔ وہ بلند شہر کے ضلع
> میں، علی گڑھ کے بالکل نواح میں، واقع تھی۔''[1]

انتظار حسین کی تاریخِ پیدائش کے سلسلے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ مرزا حامد بیگ نے اپنی کتاب، اردو

افسانے کی روایت میں انتظار حسین کی تاریخ پیدائش ۲۱/ دسمبر ۱۹۲۲ء درج کی ہے۔ کہیں کہیں پر ان کی پیدائش کی تاریخ ۱۹۲۳ء بھی مل جاتی ہے۔ اکثر کتابوں میں انتظار حسین کی تاریخ پیدائش ۲۱ دسمبر ۱۹۲۵ء ملتی ہے۔ وہاب اشرفی نے اپنی کتاب ''تاریخ ادب اردو'' کی جلد سوم میں انتظار حسین کا ذکر کرتے ہوئے ان کا سنِ ولادت ۱۹۲۵ء لکھا ہے۔

انھوں نے بھی محمد عمر میمن کے عمر کے سلسلے میں انتظار حسین کو پوچھے گئے سوالات کے جواب کا ذکر یوں کیا ہے۔

> ''بس یہ کہ میری نانی اماں اصلی تاریخ کو اس طریقے سے یاد رکھا کرتی تھیں۔ وہ کہتی تھیں ۔۔۔۔ مثلاً دلی کی عورتوں کے متعلق آپ نے یہ سنا ہوگا کہ وہ تاریخ کے حوالے اس طریقے سے دیتی تھیں کہ جب غدر پڑا تھا، یا یہ کہ ۱۸۵۷ء سے پہلے کی تاریخ، اس طریقے سے ..... کہ جب بہادر شاہ ظفر تخت پر بیٹھے تھے۔ میرا طرزِ احساس بھی کچھ اس قسم کا ہے۔ اب میں آپ کو یہ نہیں بتا سکتا کہ میں نے ہائی سکول کی تعلیم کب مکمل کی۔ لیکن ایک واقعہ میں آپ کو بتا تا ہوں کہ میں شاید نویں کلاس کا امتحان دینے گیا تھا اور اس روز میں نے یہ خبر سنی تھی کہ علامہ اقبال انتقال کر گئے تو اس حوالے سے مجھے یاد ہے کہ وہ ۱۹۳۸ء تھا۔ تو میں تو یہ تعداد و شمار، تاریخیں، سن ...... یہ میرے لئے بہت پریشان کن ہیں۔''[۲]

انتظار حسین کے انتقال کے بعد آصف فرخی نے انتظار حسین پر ایک کتاب ''چراغ شب افسانہ'' شایع کی، جس میں مصنف نے انتظار حسین کی حیات و خدمات پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ موصوف نے انتظار حسین کے قومی شناختی کارڈ اور پاسپورٹ کے حوالے سے ۲۱ دسمبر ۱۹۲۵ء کی تاریخ کو صحیح قرار دیا ہے۔ اس حوالے سے آصف فرخی یوں رقم طراز ہیں:

> ''پیدائش کی تاریخ اور سال ان کے پاسپورٹ پر

ہی درج ہے: ۲۱دسمبر ۱۹۲۵ء ۔قومی شناختی کارڈ اور دوسرے
سرکاری کاغذات میں بھی یہی اندراج موجود ہے۔''۳؎

مصنف نے اپنی اس بات کی وضاحت بھی کچھ اس طرح کی ہے:

'' اس کے باوجود ۱۹۲۵ء کی تاریخ محض قیاس نہیں
ہے۔انتظار حسین نے مجھے بتایا تھا کہ اس تاریخ کا تعین انہوں نے اپنے
والد اور بڑی بہن سے حاصل ہونے والی معلومات کی بنیاد پر کیا تھا۔''۴؎

جہاں تک ان کے نام کا تعلق ہے۔اس میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ انتظار حسین کا خاندان بہت چھوٹا تھا۔ان کی پیدائش چار بیٹیوں کے بعد ہوئی تھی۔والدین کسی بیٹے کا انتظار کر رہے تھے۔اس لیے ان کا نام انتظار حسین رکھا گیا۔کیوں کہ طویل انتظار کے بعد ان کی یہ مُراد پوری ہوئی تھی۔اس ضمن میں موصوف اپنی خودنوشت لکھتے ہیں:

'' خاندان کے شجرۂ نسب کی تکمیل کے سلسلے میں انھیں میرے
مرحوم والد مظفر علی کے خاندان کی تفصیلات مطلوب ہیں۔ میں نے بتایا
کہ پانچ بہنیں اور ایک بھائی یہ کل خاندان ہے۔چار بہنیں مجھ سے بڑی
تھیں،جو اللہ کو پیاری ہوگئیں اور ایک بہن مجھ سے چھوٹی ہے اور ابھی
تک بقید حیات ہے''۔۵؎

بی بی سی نیوز اردو(اردو BBC NEWS) نامی ایک یوٹیوب چینل پر ۲۸مئی ۲۰۱۳ء کو ایک انٹرویو کے دوران جب ان کے نام کو لے کر یہ سوال ہوتا ہے کہ:

انٹرویئر: انتظار حسین صاحب سب سے پہلے آپ ہمیں اپنے نام کے بارے میں بتائے۔۔۔۔۔۔میں کسی اور انتظار کو نہیں جانتا۔

آپ جانتے ہیں کیا؟

انتظار حسین : میں نے تو یہ نام نہیں سنا تھا پہلے ۔اس کے بعد ایک آدھ دفعہ سننے میں آیا کوئی نام جو ہمارے یہاں چلتا تھا۔'انتسا' تھا وہ ریڈیو میں کام کرتے تھے ۔ پروگرام ''حامد میاں'' کے لیے مشہور تھے۔

''اصل میں میرے نام کا معاملہ یہ ہے کہ مجھ سے پہلے چار بہنیں ہو چکی ہیں اور ہمارے خاندان کو بڑا انتظار تھا کہ کوئی لڑکا بھی پیدا ہو ۔ میں جب پیدا ہوا تو اس طویل انتظار کی بنا پر انھوں نے میرا نام انتظار تجویز کیا۔اس طریقے سے یہ نام رکھا گیا۔'' ۶

مقام پیدائش وسکونت :

تاریخ پیدائش کے برخلاف انتظار حسین نے مقامِ پیدائش کے سلسلے میں کھل کر بات کی ہے ۔انھوں نے اکثر مواقع پر اس جگہ کا ذکر کیا ہے ۔اس جگہ کا نام ڈبائی ہے، وہ ایک چھوٹی سی بستی تھی ، جو اب ایک قصبے میں تبدیل ہو گائی ہے ۔ ڈبائی علی گڑھ کے قریب (تقریباً ۴۵ کلو میٹر) ضلع بلند شہر میں واقع ہے ۔انھوں نے اپنے بچپن کے دس گیارہ برس یہیں گزارے ۔انتظار حسین کا گھر ڈبائی کے شیخان محلّہ میں تھا۔شیخان محلّہ ڈبائی کے بازار سے منسلک ایک محلّہ تھا جس کے ٹھیک بعد ہندوؤں کی بستی شروع ہو جاتی تھی ۔شیخان محلّہ کے اطراف میں ہندوؤں کی آبادی تھی ۔اس محلّہ کے آخر میں ایک مسجد تھی ۔جس سے کچھ دوری پر ایک کربلا بھی تھا۔انتظار حسین نے جب بھی اپنی بستی کا ذکر کیا ہے اس کربلا اور اس کے پاس کر ویرانی سے پیدا ہونے والے خوف کا بھی ذکر کیا ہے ۔اسی طرح چامنڈا دیوی کے مندر اور وہاں کے خوف واسرار میں ڈوبی فضا کا بھی نقشہ اکثر جگہوں پر کھینچا ہے ۔انھوں نے ہر موقعے پر ڈبائی کی چھوٹی چھوٹی جزئیات کو حسرت سے یاد کیا ہے ۔وہاں کی درو دیوار میں جو تہذیب بستی تھی ، اسے انتظار حسین زندگی بھر اپنے فکشن میں برتنے کی کوشش کرتے رہے ۔انھوں نے اپنی خود نوشت 'جستجو کیا ہے' میں ڈبائی کا ذکر تفصیل سے کیا ہے ۔ان کو ڈبائی کے کچھ کھیلوں جیسے گلی ڈنڈا ، پتنگ بازی وغیرہ کا بہت شوق تھا انھوں نے اپنے

بچپنے میں فطری اور قدرتی مناظر سے خوب لطف اٹھایا۔ وہ جنگلوں میں جا کر آم، جامن، بیر، نیم اور املی کی شاخیں توڑتے اور دوستوں کے ساتھ خوب دھما چوکڑی مچاتے تھے۔ سہیل احمد کے ایک انٹرویو میں مصنف نے اپنی بستی کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے:

''علی گڑھ کے قریب بلند شہر کے ضلع میں ایک چھوٹی سی بستی تھی ، سنتے ہیں اب بھی ہے۔ اس بستی میں پیدا ہوا۔ جہاں تک میرا خیال ہے میں دس گیارہ سال کی عمر تک اس بستی میں رہا ہوں۔ وہ تو دس ال تھے یا دس گیارہ سال تھے، مجھے یوں لگتا ہے کہ وہ ایک پوری صدی تھی۔ وہ علاقہ، وہ چھوٹی سی زمین، وہ بستی، اس کے باہر کے چھوٹے چھوٹے دیہات جہاں میں کبھی کبھی یکّے میں بیٹھ کر جایا کرتا تھا اور کبھی بیل گاڑی میں، ان سب چیزوں کو دھان میں لاتا ہوں تو مجھے یوں لگتا ہے کہ وہ چھوٹی سی زمین پورا براعظم تھی۔ تو اب میں اس بستی کی کس کس چیز کا ذکر کروں؟ ان درختوں کا ذکر کروں جن کے سائے میں میں نے پرورش پائی اور تربیت حاصل کی۔ املی کے پیڑوں کا، نیم کے پیڑوں کا ذکر کروں جو میں نے ان دنوں دیکھے یا ان مخلوقات کا ذکر کروں جن سے میں خوف کھاتا تھا اور جو نظر نہیں آتی تھیں اکثر اوقات میں جنگل میں بیر توڑنے کے لیے یا املی کے کٹارے لینے کے لیے جاتا تو مجھے اندیشہ لگا رہتا کہ وہ مخلوق سامنے نہ آجائے۔ عجب وسوسوں اور اوہام کی دنیا تھی جس میں میں سانس لے رہا تھا۔'' ؎

اس کے بعد مصنف کا خاندان ہاپوڑ منتقل ہوگیا۔ ہاپوڑ منتقلی کی وجہ انھوں نے اپنی خودنوشت 'جستجو کیا ہے' میں اپنے بھائی کا روزگار بتایا ہے۔ ہاپوڑ میں مصنف کے والد کے ماموں مقیم تھے جو حکومت میں کافی اثر و رسوخ

رکھتے تھے۔ انھی کی مدد سے ان کے بہنوئی کے روزگار کا انتظام ہو سکا۔ وہاں انتظار حسین کے دادا یعنی ان کے والد کے ماموں، میاں جان، کے نام سے مشہور تھے۔ اعلیٰ درجے کے بزرگ تھے۔ آس پاس کے علاقے میں ان کا خوب نام تھا۔ ان کے بیٹے نے باپ سے بڑھ کر نام کمایا تھا۔ انگریزوں نے انھیں خان بہادر کے لقب سے سرفراز کیا تھا۔ وہ اپنے گھر میں ہی کچہری لگاتے اور لوگوں کے مسائل سن کر فیصلہ سناتے تھے۔ وہاں انتظار حسین کے خاندان کی سکونت محلّہ قانون گویاں میں تھی۔ ڈبائی سے ہاپوڑ منتقل ہونے کا سبب بیان کرتے ہوئے انتظار حسین رقمطراز ہیں:

> ''مگر خیر ذکر تو میں ہاپوڑ والے دادا جان کا کر رہا تھا۔ جن کو پورا خاندان میاں جان کے نام سے پکارتا تھا۔ ڈبائی میں رہتے ہوئے ان کا ذکر ایسے سنا تھا جیسے وہ کوئی داستانی دادا ہیں۔ اب آ کر دیکھا تو سچ مچ کے دادا نکلے۔ جیسا سنا تھا، ویسا ہی پایا۔ ملازمت کے طلب گاروں کے لیے ملازمت کی سفارش، ملازمت والوں کے لیے ترقی ۔۔۔۔۔۔۔ میری والدہ نے بھی شاید ایسے ہی کسی معاملہ میں ان سے رجوع کیا تھا۔ وہ اپنے ایک داماد کی بیروز گاری سے پریشان تھیں۔ اس کا تو فوری بندوبست بطرز احسن ہو گیا مگر اس ریلے میں ہمارا گھر ہاپوڑ منتقل ہو گیا۔'' ۸

خاندانی صورتِ حال:

انتظار حسین کے والد کا نام منظر علی اور دادا کا نام امجد حسین تھا۔ والدہ کا نام صغریٰ بیگم اور نانا کا نام وصیت علی تھا۔ انتظار حسین کی پانچ بہنیں تھیں۔ بھائیوں میں وہ تنہا تھے۔ انتظار حسین نے اپنے والد کے سلسلے میں یہ اطلاع بہم پہنچائی کہ وہ عقیدے سے شیعہ تھے اور مبلغ قسم کے آدمی تھے، مزید انھوں نے یہ اطلاع بہم پہنچائی کہ ان کے خاندان کی ہر نسل میں کوئی نہ کوئی بڑا فقیر یا درویش یا صوفی ہوتا رہا ہے۔ ان کے والد کے ماموں ایک صوفی

بزرگ کی حیثیت سے معروف تھے۔لیکن والد واعظ اور مبلغ بھی رہے انھوں نے یہ بھی بتایا کہ ان کا خاندان پہلے سنیوں کا خاندان تھا۔لیکن ان کے والد شیعہ ہوگئے۔موصوف اس پر اصرار کرتے ہوئے کہ اصلاً ان کا خاندان شیعہ تھا۔بعد میں سُنی ہوگیا تھا۔انتظار حسین کہتے ہیں کہ ان کے چچاؤں اور والد کے درمیان برابر مناظرہ ہوکرتا تھا۔

انتظار حسین کے والد ایک مولوی صفت شریف انسان تھے جنہوں نے اپنی پوری زندگی سادگی اور عبادت میں گزاری۔ان کے والد روزگار کے لیے ابتدائی دنوں میں اپنے کسی عزیز کی زمینوں کی رکھوالی کرتے تھے۔ بعد میں اس تحریک سے جُڑ گئے جو جنت البقیع کے مزارات کے انہدام کے خلاف ہندستان میں چلائی جارہی تھی۔اس تحریک سے جُڑنے کے بعد مصنف کے والد نے عربی زبان وادب میں مہارت حاصل کرلی۔اسی تحریک سے متاثر ہوکر وہ اپنے بیٹے کو اسکول کی تعلیم کے بجائے عربی تعلیم دلا کر مولوی اور واعظ بنانا چاہتے تھے۔انتظار حسین کی ابتدائی تعلیم کا انتظام بھی انہوں نے گھر پر اسی نہج پر کیا تھا۔ابتدائی دنوں میں انھیں عربی کی اتنی تعلیم دے دی گئی تھی کہ جب انھیں ایم اے کے دوران دوسری زبان کا انتخاب کرنے کا موقع ملا تو انتظار حسین نے عربی زبان کا انتخاب کیا۔انتظار حسین کے والد صوفی صفت انسان تھے۔علم نجوم سے ان کو کافی شغف تھا اوستاروں کی نقل وحرکت پر خاص نظر رہتی تھی۔وہ قمری مہینوں کو مانتے تھے۔او چاند کی انتیسویں تاریخ کو چھت پر جا کر چاند دیکھنے کا مسلسل اہتمام کرتے تھے۔انتظار حسین نے اپنے والد کے سلسلے میں اپنی خودنوشت 'جستجو کیا ہے' میں لکھا ہے۔

> '' والد صاحب چاند کے ہر دکھ سکھ میں شریک تھے۔جب وہ کسی مشکل برج میں داخل ہوتا اور مشکل میں پھنس جاتا تو والد صاحب کسی خضوع وخشوع سے اس کی مشکل کے حل کے لیے دعا کرتے۔چاند گہن لگنے کے ساتھ ہی جاءنماز پہ بیٹھ جاتے۔ایسے موقع پر جو نماز پڑھنی چاہیے وہ نماز پڑھتے۔اور وہ ساری دعائیں جو اس مشکل گھڑی میں پڑھنی چاہئیں وہ پڑھتے۔پھر دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا کرتے کہ اے خالق ارض وسماءاے شمس وقمر کے رکھوالے۔قمر اس گھڑی مشکل میں ہے،اسے

اس مشکل سے نکال''۔ ۹

انھوں نے اپنے والد کے متعلق محمد عمر میمن سے ایک انٹرویو میں بتایا کہ:

''میں اپنے والد صاحب سے پہلے اپنے اجداد کے متعلق ایک بات عرض کروں : میں بچپن میں سنتا رہا ہوں کہ ہمارے خاندان ۔۔۔۔۔۔ جو بڑے عامل قسم کے آدمی تھے ۔ اور پورے علاقے میں ایک صوفی اور ایک بزرگ کی حیثیت سے جانے جاتے تھے ۔ جہاں تک میرے والد صاحب کا معاملہ ہے تو افسوس ہے کہ وہ اس روایت میں نہیں تھے ۔ وہ کچھ واعظ اور مبلغ قسم کے آدمی تھے ۔'' ۱۰

انتظار حسین کی والدہ مذہبی اور گھریلو خاتون تھیں ۔ وہ نہایت شائستہ اور نفیس الطبع عورت تھیں ۔ آصف فرخی نے انتظار حسین کی بھانجی نسیم زہرہ صاحبہ کے حوالے سے اپنی کتاب 'چراغ شب افسانہ' میں لکھا ہے کہ انتظار حسین کو نفاست اپنی ماں سے وراثت میں ملی تھی ۔ انتظار حسین اپنی والدہ سے بہت محبت کرتے تھے ۔ حالاں کہ انھوں نے اپنی ماں کے سلسلے میں کسی کتاب میں زیادہ تفصیل بیان نہیں کی ہے ۔ ان کے والدین تقسیم کے بعد پاکستان آ گئے تھے ،اور ان کے ساتھ ہی قیام کیا ۔ حالاں کہ ان کی والدہ اپنی آخری عمر میں اپنی چھوٹی بیٹی کے ساتھ رہنے لگی تھیں ۔ انھوں نے تقریباً سو سال کی عمر پائی ۔ ان کے والد کا انتقال ۱۹۶۳ء میں ہوا ۔

انتظار حسین نے اپنے دادا امجد علی کو نہیں دیکھا تھا مگر خاندان کے دو بزرگ صادق علی اور دلشاد علی کو دادا کہتے تھے ۔ یہ دونوں بھائی انتظار حسین کے والد کے ماموں تھے ۔ انھوں نے انتظار حسین کو خوب پیار دیا ۔ دلشاد علی ڈبائی سے کچھ فاصلے پر واقع ایک بستی دانپور میں رہتے تھے ۔ انتظار حسین کی خاندانی جڑیں دانپور سے ہی وابستہ ہیں ۔ ان کے داداؤں کا اصل خاندانی گھر دانپور میں ہی تھا ۔ انتظار حسین کے دوسرے دادا صادق علی ترقی کر کے خان بادر ہو گئے تھے وہ بھی مذہبی قسم کے آدمی تھے ۔ اور سنّی حنفی مسلک کے ماننے والے تھے ۔ اس لیے انھیں تفضیلی کہا جاتا تھا ۔ انتظار حسین نے اپنے خاندان کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے :

''یار کہیں گے کہ خاندان کے دور پرے کے عزیزوں، رشتہ داروں کا اتنا ذکر کیا، کچھ خاص اپنے گھرانے کے متعلق تو بتاؤ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ایک ماموں، ایک چچا، ایک خالہ، پھوپھی، ندارد، پانچ بہنیں، بھائی کے نام صفر، بھانجے، بھانجیاں قطار اندر قطار۔۔۔۔۔۔لو اب لکھتے ہوئے احساس ہو رہا ہے۔ پہلے یہ خیال ہی نہیں آیا تھا کہ کتنے اہم رشتے تو میری زندگی سے خارج ہیں''۔ [11]

اپنے بھائی بہنوں کی تفصیل بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''پانچ بہنیں اور ایک بھائی۔ یہ کل خاندان ہے۔ چار بہنیں جو کہ مجھ سے بڑی تھیں، اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ ایک بہن جو کہ مجھ سے چھوٹی ہے اور ابھی تک بقید حیات ہے۔'' [12]

انتظار حسین نے اپنی زندگی کے سلسلے میں بہت تفصیل بیان نہیں کی ہے۔ ان کی خودنوشت 'جستجو کیا ہے' میں ان کی زندگی سے متعلق کچھ معلومات مل جاتی ہیں۔ اسی طرح ان کی یاداشت 'چراغوں کا دھواں' میں ان کی زندگی سے متعلق کچھ جھلکیاں کہیں کہیں بیان ہوئی ہیں۔ آصف فرخی انتظار حسین کے بڑے ناقد بھی ہیں اور ان کے اچھے دوست بھی۔ انھوں نے انتظار حسین کے انتقال کے بعد ایک کتاب 'چراغ شب افسانہ' لکھا۔ اس کتاب میں ان کی زندگی اور ان کے فن پارے پر کافی تفصیل سے کام لیا گیا ہے۔ اس کتاب کی خاص بات یہ ہے کہ آصف فرخی نے اس میں بہت سی تفصیلات انتظار حسین سے ذاتی ملاقاتوں اور یادداشتوں کے حوالے سے بیان کی ہیں۔ ان کی بہنوں اور ان کے شوہروں سے بھی آصف فرخی کے کافی اچھے مراسم رہے ہیں۔ انتظار حسین کی بہنوں اور بھانجے بھانجیوں کے حوالے سے آصف فرخی نے کافی تفصیلات اپنی کتاب میں رقم کی ہے۔

انتظار حسین کی سب سے بڑی بہن کا نام حسنین فاطمہ تھا اور شادی شمشاد حسین سے ہوئی تھی۔ چوں کہ یہ انتظار حسین کی سب سے بڑی بہن تھیں اس لیے خاندان کے معاملات میں ان کی مداخلت اور مشورے بہت اہم

ہوتے تھے۔ انتظار حسین کی زندگی کے سلسلے میں تمام بڑے فیصلے انھوں نے ہی کیے تھے۔ انتظار حسین کے والد انھیں دینی تعلیم کی طرف لے جانا چاہتے تھے مگر انھوں نے ہی اپنے والد کے فیصلے کی مخالفت کرتے ہوئے انھیں اسکولی تعلیم کے لیے داخل کرایا۔ یہاں تک کہ ان کی شادی کے لیے لڑکی تلاش کرنے کی ذمہ داری بھی انھیں کی تھی ۔تقسیم کے بعد حسنین فاطمہ اپنے کنبے کے ساتھ کراچی میں مقیم ہوئیں۔

حسنین فاطمہ سے چھوٹی بہن کا نام سیدہ فاطمہ تھا۔ وہ ہجرت کے بعد ملتان میں بس گئیں تھیں۔ ان کی قبر بھی ملتان میں ہی ہے۔ تیسری بہن کا نام زہرا تھا۔ ان کی شادی ان کے چچا کے خاندان میں ہوئی تھی اور ان کے شاہر گوالیار میں ملازمت کرتے تھے۔ ان بہنوں میں سے کوئی بھی اب بقید حیات نہیں ہیں۔ مذکورہ آخری بہن کا انتقال تقسیم سے قبل ہی ہو گیا تھا۔

چار بہنوں کے بعد مصنف خود تھے۔ چار بہنوں کی پیدائش کے بعد مصنف کی پیدائش ان کے نام کی وجہ بھی تھی۔ انتظار کے لمبے عرصے کے بعد گھر میں ایک بیٹا پیدا ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا انتظار حسین رکھا گیا۔ ان سے چھوٹی بہن سائرہ خاتون ہے جو اب بھی بقول آصف فرخی اپنے بچوں کے ساتھ کراچی میں مقیم ہیں۔

انتظار حسین نے اپنے خاندان کو 'چتکبرا' کا نام دیا ہے۔ والد کے خاندان میں اکثر لوگ سُنّی تھے اور والدہ کے خاندان کے اکثر لوگ شیعہ۔ انتظار حسین کے والد نے شیعہ عقیدہ اپنا لیا تھا۔ اس زمانے میں شادیوں کے لیے شیعہ اور سنی کا افتراق نہیں تھا۔ ایسی شادیاں عام تھیں۔ لڑکی کی جس گھرانے میں شادی ہوتی وہ اسی مسلک کو ماننے لگتی۔ شیعہ اور سنی کے اسی ملن کو انتظار حسین نے چتکبرا کا نام دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''اصل میں ہمارا خاندان چتکبرا ہے۔۔۔۔ ایسا ویسا کہ ایک
> رنگ کچھ زیادہ گہرا ہو گیا ہے۔ بس یہ سمجھ لو کہ شیعہ تو بس آٹے میں نمک
> کی نسبت۔۔۔۔ سب اہل سنت۔ یہ میں والد کی طرف سے جو ہمارا
> خاندان ہے۔ اس کا ذکر کر رہا ہوں۔ والدہ کی طرف سے سب یک رنگ
> تھے یعنی خالص مولائی۔'' ۱۳

تعلیم وتربیت:

انتظار حسین کی تعلیم کی ابتداء گھر سے ہوئی ان کے والد ایک مولوی صفت انسان تھے۔اور انتظار حسین کو مذہبی تعلیم کے لیے مدرسۃ الواعظین میں داخل کرانا چاہتے تھے۔اس لیے گھر سے ہی عربی تعلیم شروع کر دی۔ابتدائی عربی کے علاوہ صرف ونحو کی تعلیم مصنف کے والد نے گھر پر ہی دی۔انتظار حسین کے والد انگریزی تعلیم کے حق میں کبھی نہیں تھے۔اور وہ انتظار حسین کو مذہبی تعلیم دلوا کر واعظ بنانا چاہتے تھے۔ابتدائی تعلیم کا ذکر مصنف نے اپنی خودنوشت 'جستجو کیا ہے' میں اس طرح کیا ہے:

> ''میرے والد تعلیم کی جو قبا مجھے پہنانے کے در پے تھے اس کی وجہ سے یہ سوال اٹھنا ہی تھا۔اصل میں میرے والد اپنے اسلامی مطالعے کے زور پر مولویوں سے بڑھ کر مولوی تو بن ہی چکے تھے،سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ کسی بھلے وقت میں وہ شیعہ کانفرنس کی شروع کی ہوئی تحریک میں بھی سرگرم عمل رہے تھے۔وہیں سے شاید۔۔۔۔۔ابتدائی عربی پڑھا کر مدرسۃ الواعظین میں داخل کرا دیا جائے کہ وہاں سے عالم فاضل بن کر نکلے گا اور مجتہد بن جائے گا۔تو ابی میں تختی پہ ا،ب،ت لکھ رہا تھا اور بغدادی قاعدہ ختم کر چکا تھا کہ انھوں نے مجھے ایک 'الصرف'' نام کی کتاب مجھے پکڑا دی۔'' ۱۴

اس طرح عربی کے ذریعے انتظار حسین کی تعلیم کا آغاز ہوا۔انتظار حسین کے خاندان میں اگر کسی ایک دو آدمی نے کہا بھی کہ لڑکے کو کسی اسکول میں داخل کر دو تو ان کے والد نے صاف انکار کر دیا۔اس لئے کہ ان کے والد کو نہ اسکول کے پڑھنے والے لڑکوں پر بھروسہ تھا اور نہ ہی اسکول کی تعلیم پر کوئی اعتبار تھا۔ان کے والد کا ماننا تھا کہ اسکول کی تعلیم اور وہاں کا موحول انتظار حسین کو خراب کر دے گا۔اس لئے ان کے والد نے گھر پر ہی عربی ،انگریزی اور ساتھ میں میٹرک کے تمام مضامین پڑھنا شروع کئے۔دس بارہ سال ڈبائی میں ہی والد کی محبت اور

لائبریری سے استفادہ کرتے رہے۔اس کے بعد با قاعدہ تعلیم کی غرض سے ہاپوڑ کی طرف ہجرت کی۔

ہاپوڑ منتقلی کے بعد انتظار حسین کی بڑی بہن نے والد کے فیصلے سے اختلاف کیا اور بھائی کو اسکول اور کالج کی تعلیم دلانے کا فیصلہ کیا۔اس فیصلے کے بعد ان کا داخلہ۔کمرشل اینڈ انڈسٹریل ہائی اسکول' کی آٹھویں جماعت میں ہو گیا۔یعنی انھوں نے با قاعدہ اسکولی تعلیم کی ابتدا آٹھویں جماعت سے کی۔میٹرک فرسٹ ڈویژن سے پاس ہونے کے بعد ان کی بڑی بہن ان کو ڈپٹی کلکٹر بنانا چاہتی تھیں مگر انتظار حسین کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔میرٹھ کالج س ءانھوں نے ایف اے(۱۹۳۲ء) بی اے(۱۹۴۴ء) ایم اے اردو(۱۹۴۷ء) میں کیا۔

انتظار حسین کے سب سے قریبی دوست ریوتی سرن شرما اسی اسکول سے ساتھ تھے۔دوران تعلیم ان کی نوکری ریڈیو میں ہو جانے کی وجہ سے وہ دہلی چلے گئے۔ریوتی سرن شرما کی شادی کرشن چندر کی بہن شرلا دیوی سے ہوئی تھی۔انتظار حسین کے اسکول کے اساتذہ میں مہتہ صاحب تاریخ کے استاد تھے۔مہتہ صاحب کو اکبرالہ آبادی کے اشعار نہ صرف پسند تھے بلکہ وہ بچوں کو پڑھانے کے دوران ان کی ظرافت بھری شاعری سے بھی محظوظ کراتے تھے۔وجندی جی ہندی کے قابل استاد تھے۔جو بعد میں دلی یونیورسٹی کے صدر شعبہ کے عہدے سے رٹائر ہوئے۔مصنف کو نہ صرف مانتے تھے بلکہ ان سے اردو سیکھنے کی خواہش بھی رکھتے تھے۔انتظار حسین جب پاکستان سے دلی کے سفر پر آئے تو وجندر جی سے ملاقات ہوئی۔ان کے ہر دلعزیز دوست ریوتی بھی ساتھ تھے۔اس ملاقات کی تفصیل انھوں نے اپنے سفر نامہ 'نئے شہر پرانی بستیاں' میں رقم کیا ہے۔

ایم اے کے دوران انتظار حسین کا رجحان شاعری اور تنقید کی طرف پیدا ہو گیا۔دوران تعلیم انھوں نے شاعری بھی کی اور آزاد نظمیں بھی لکھیں مگر وہ زیادہ دن اس راستے پر نہیں چل سکے۔انھوں نے سب سے پہلی تحریر تنقیدی مضمون کے طور پر لکھا:

انتظار حسین کے ہر دلعزیز استاد کرار صاحب سے ملاقات میرٹھ کالج میں ہی ہوئی تھی۔کرار صاحب میرٹھ کالج میں پروفیسر تھے۔انتظار حسین کی تربیت میں کرار صاحب کا اہم رول رہا ہے۔مصنف نہ صرف اپنے استاد کی عزت کرتے تھے بلکہ تا عمر ان کے احسانوں کو بیان بھی کرتے رہے ہیں۔آخری عمر میں انتظار حسین نے کرار

صاحب کے خطبات کا مجموعہ بھی مرتب کیا۔ میرٹھ میں کرار صاحب کا گھر ان کے شاگردوں اور دوستوں کے لیے ہمیشہ کھلا رہتا تھا۔ ان کے گھر پر ہی انتظار حسین نے کئی بڑی شخصیتوں سے ملاقات کی۔ انتظار حسین کے کالج کے اساتذہ میں کرار صاحب کے علاوہ، پروفیسر مظہری، پروفیسر جیلانی اور شریف صاحب وغیرہ تھے۔ میرٹھ کالج میں انتظار حسین کے دوستوں میں سلیم احمد، خلیق احمد نظامی، جمیل جالبی، عاصم سبزواری، اور شفیق احمد وغیرہ تھے۔

شادی اور ازدواجی زندگی:

انتظار حسین کی شادی عالیہ بیگم سے مارچ ۱۹۶۶ء میں ہوئی۔ یہ ایک روایتی شادی تھی۔ شادی کے لیے لڑکی تلاش کرنے کی ذمہ داری انتظار حسین کی بڑی بہن حسنین فاطمہ نے نبھائی۔ عالیہ بیگم کا خاندان بنارس سے ہجرت کر کے پاکستان گیا تھا۔ ان کا سلسلہ نوابین سے ملتا تھا۔ محترمہ کا تعلق ہندستان کی ریاست بہار سے بھی تھا۔ اپنی سسران کے حوالے سے وہ خود کو نصف بہاری بھی کہتے ہیں۔ دراصل انتظار حسین کا سسرال شہر گیا سے متعلق تھا۔ ان بیگم کے ایک بزرگ طبیب/حکیم بڑے صاحب نے شہر گیا کے محلّہ مُراد پور میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ انھیں کے خاندان سے عالیہ بیگم کا تعلق ہے۔ انتظار حسین کا آنگن ہمیشہ بچوں کی کلکاریوں سے محروم رہا یعنی ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ عالیہ بیگم ایک گھریلو عورت تھیں۔ انھوں نے انتظار کی ادبی زندگی کو کامیاب بنانے میں بہت دلچسپی لی تھی۔

جس کا ذکر انھوں نے اپنے مکالموں میں بار بار کیا ہے۔ عالیہ بیگم کی ایک مختصر علالت کے بعد ۲۴ جنوری ۲۰۰۵ء میں انتقال ہو گیا اور ان کی تجہیز و تکفین لاہور میں ہوئی۔ اپنی اہلیہ کے خاندان کے سلسلے میں مصنف نے ارتضیٰ کریم کے سوالوں کے جواب دیتے ہوئے ایک ذاتی خط میں لکھا کہ:

> ’’آپ نے پھر اتنے بہت سے سوال کر ڈال ہیں۔ مشکل سوال نہیں ہیں، مگر میرے لیے مشکل ہیں۔ مثلاً یہ کہ اپنی شادی اور خاندان کی تفصیلات کیا لکھوں۔۔۔۔ یہ تو روایتی قسم کی شادی تھی۔ مارچ

۱۹۶۶ء میں ہوئی ۔ بیگم کا نام عالیہ بیگم ہے ۔ یہ بنارس کا خاندان ہے ۔ جس کا سلسلۂ نسب اودھ کے نوابین سے ملتا ہے ۔ میرے اپنے خاندان کو ایسا کوئی شرف حاصل نہیں ہے ۔ بلند شہر میں ایک قصبہ ڈبائی ہے ۔ وہاں

میں پیدا ہوا ۔ مگر ہمارا خاندان زیادہ تر ہاپوڑ (میرٹھ) میں آباد تھا ۔ سونو دس سال کی عمر میں ، میں اپنے والدین کے ساتھ ۔۔۔۔۔۔۔ مگر اسی خاندان میں ایسے بھی تھے جو سرکاری ملازمت کے واسطے سے ترقی کرتے کرتے خان بہادر، خان صاحب ، او ۔ بی ۔ ای ۔، ایم بی اے قسم کے مراتب سے سرفراز ہوئے ۔ دوسری طرف وہ جن کے مزاج میں تصوف کی چاشنی تھی ۔ ان میں سے کوئی عامل کوئی پیر بن گیا ۔ میرے خیال میں اتنا بہت کافی ہے ۔'' ۱۵

ہجرت کا سفر:

انتظار حسین اپنی ذہنی تشکیل کے لیے جن لوگوں کے ممنون نظر آتے ہیں ان میں سب سے پہلا نام حسن عسکری کا ہے ۔ حسن عسکری سے ان کی ملاقات میرٹھ میں دوران تعلیم ہوئی تھی ۔ انتظار حسین حسن عسکری کے گھر سے باہر تک کے ساتھی تھے ۔ ان دنوں ترقی پسند تحریک اپنے شباب پر تھی ۔ حسن عسکری اس وقت اردو کے اچھے ناقدوں میں شمار کیے جانے لگے تھے ۔ مگر ان کے ذہن نے نہ کبھی ترقی پسند تحریک کا اثر قبول کیا اور نہ ہی تحریک پاکستان، مسلم لیگ یا دیگر کسی سیاسی پارٹیوں سے وابستہ ہوئے ۔ انتظار حسین کی ذہنی تشکیل بھی اسی نہج پر ہوئی ۔ انھوں نے بھی کسی پارٹی یا جماعت کا اثر قبول نہیں کیا ورنہ ہی کسی تحریک سے منسلک ہوئے ۔

انتظار حسین نے حسن عسکری کے بلاوے پر ہی ہندستان سے ہجرت کی تھی ۔ تقسیم کے بعد کے فسادات

نے ڈاک کی خدمات کو بھی متاثر کیا تھا۔ دونوں ملکوں کے درمیان کے خطوط یا خبروں کے لیے مشکل پیدا ہوگئی تھی۔ پاکستان سے اگر کسی کو خبر بھجوانی ہوتی تو وہ ایک پرچی میں لکھ کر ریڈیو اسٹیشن میں دے دیتا۔ ریڈیو سے ہر دن اس طرح کی اطلاعات نشر کی جاتی تھیں۔حسن عسکری نے ریڈیو کے ذریعہ ہی اپنے گھر والوں کے لیے اعلان نشر کروایا کہ وہ پاکستان چلے آئیں ساتھ ہی یہ اعلان بھی نشر ہوا کہ ''انتظار سے کہو کہ وہ بھی یہاں آجائے'' اس لیے انتظار حسین اپنے گھر والوں کے مشورے اور اجازت کے بعد عسکری صاحب کے خاندان کے ساتھ پاکستان کے لیے رخصت ہوئے۔ پاکستان جانے کا مطلب اس وقت ہرگز یہ نہیں تھا کہ جو جدھر گیا اُدھر کا ہی ہوکر رہ جائے گا۔ اسے دوسری طرف آنے جانے کی اجازت نہیں ہوگی۔ بارڈر کی پابندیاں تو ان مہاجرین کو بہت بعد میں سمجھ آئیں۔ انتظار حسین کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''ادھر پاکستان جانے کا سان نہ گمان مگر عسکری صاحب کا پیغام جیسے کسی نے خاموش حوض میں اینٹ پھینک دی۔۔۔ پھر سوچا کہ میں۔۔۔گھر جاؤں ،سوال ڈالوں، دیکھوں کیا جواب آتا ہے۔۔۔ والدہ تو اللہ میاں کی گائے۔۔۔سو ان کی سمجھ ہی میں نہ آیا۔۔۔ہمیں چھوڑ کے کہاں۔۔۔اس وقت پاکستان جانے کا مطلب یہ نہیں لیا جا رہا تھا کہ ہم اِدھر تم اُدھر۔۔۔دیکھنے کو ترس جائیں گے۔'' ١٦

بہر حال انتظار حسین ،سلیم احمد اور عسکری صاحب کے گھر والوں کو جاتا دیکھ پاکستان جانے والی ٹرین میں سوار ہوگئے اور لاہور اسٹیشن پہنچ گئے۔ لاہور میں ان کا قیام عسکری صاحب کے ساتھ ہی تھا۔ جو پہلے سے ہی اپنے کسی رشتہ دار کے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ کچھ مہینوں کے بعد جب انتظار حسین کے دو بھانجے انصار حسین اور حسن ظہیر نقل مکانی کر کے لاہور پہنچے تو انتظار حسین ان کے ساتھ شفٹ ہوگئے۔ کچھ دنوں کے بعد انتظار حسین کے والدین بھی لاہور آگئے۔

انتظار حسین کو ہندستانی تہذیب اور خاص کر گنگا جمنی تہذیب سے بے حد لگاؤ تھا۔ ہندستانی رسم و رواج

،عقائد، تیوہار وغیرہ ان کی تحریروں میں خاص طور سے ملتے ہیں ۔ڈبائی میرٹھ اور ہاپوڑ کی گلیوں سے جو یادیں انھوں نے سنجوئے تھے اس میں ہندستان کی تہذیب بھی تھی ۔ ہجرت کے بعد انھیں اپنی تہذیب سے کٹنے کا شدت سے احساس تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

''مگر کیا چلنے سے پہلے میں نے اس سفر کے معنی و مطلب پر غور کیا تھا۔کیا مجھے دھیان آیا تھا کہ میں ایک بکھرتی تہذیب کو جس نے بننے سنور نے میں کم وبیش ایک ہزار سال لیے تھے، اس کے حال پر چھوڑ کر رخصت ہو رہا ہوں ۔'' ١٧

یہی وہ سوالات تھے جس نے انتظار حسین کو زندگی کو زندگی بھر پریشان کیا۔ اسی سوال کے نتیجے کے طور پر ان کی کئی عظیم تخلیقات بھی وجود میں آئیں ۔ بہرحال حسن عسکری کے بلاوے کے بعد مصنف لاہور پہنچے اور وہیں سکونت اختیار کر لی ۔ اپنے پڑاؤ کے سلسلے میں وہ لکھتے ہیں ۔

'' تو میں انتظار حسین اولاً پناہ گیر ثم مہاجر جب منہ اندھیرے سپیشل ٹرین سے مغلپورہ اسٹیشن پر اترا تو میں نقدم ہاتھ میں ایک بیگ سٹیشن سے نکل ایک نقل مکانی کرنے والے خاندان کے پیچھے چلتا ہوا ایک ایسے کوچے میں پہنچا جو اجڑ کر اب پھر سے آباد ہو چلا تھا۔ کرشن نگر اس کوچہ کا نام تھا۔..............تو میرا پہلا پڑاؤ اس کوچہ میں ہوا مگر کہاں ،کیسے، کونسے گھر میں مجھے سر چھپانے کے لیے جگہ ملی ۔ اس کی داستان اس طرح ہے کہ جو شخص اب سے ڈھائی تین ہفتے پہلے آ کر اس گھر میں مہمان ہوا تھا ۔ میں اس کا مہمان درمہمان ۔ان دنوں اسی رنگ سے مہمانیاں چل رہی تھیں اور اپنے عروج پر تھیں ۔'' ١٨

روزگار/ ملازمت:

مصنف نے روزگار کی ابتداء بھی میرٹھ سے ہی کی تھی۔ایم اے کے دوران بہت سے طلباء روزگار بھی کرتے اور ساتھ کرار صاحب کے گھر جا کر شام کو درس بھی لیتے۔انتظار حسین بھی اسی راستے پر چل پڑے۔انھیں راشننگ آفیسر کی نوکری مل گئی۔

''ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ میں نے کتنے سینئر طلباء کو دیکھا کہ بی اے کے بعد طور یہ ہے کہ وہ عارضی جنگی دفتر کھلے ہوئے ہیں ان میں سے کسی میں ملازمت ۔۔۔۔۔۔۔ کے ٹھکانے پر جا کر اردو ایم اے کی کلاس میں حاضری دے رہے ہیں ۔ میں نے بھی یہی نسخہ آزمانے کی ۔۔۔۔۔ اس کی وجہ سے سرکار نے راشننگ کا نسخہ استعمال کیا اور راشننگ کا محکمہ قائم ہوگیا۔یعنی اب گیہوں ۔۔۔۔۔ ہر علاقے میں ایک راشننگ دفتر ۔۔۔۔۔ ان پر تعینات ایک سینئر انسپیکٹر جو اس علاقہ کے دفتر کا ہیڈ ہوگا۔جسے یہ انسپکٹری مل گئی اس کے وارے نیارے ہوگئے۔''

[19]

انتظار حسین کو بھی سینئر انسپیکٹر کی نوکری مل گئی۔اس طرح سے میرٹھ میں رہ کر پڑھائی کے ساتھ ساتھ روزگار کا بھی انتظام ہوگیا۔مگر جلدی ہندستان اور پاکستان کی تقسیم ہوگئی اور انتظار حسین ہجرت کر کے لاہور چلے گئے۔

ہجرت کے بعد انھوں نے روزگار کے طور پر صحافت کے میدان کو چنا۔چنانچہ پاکستان پہنچنے کے بعد سب سے پہلی نوکری ہفت روزہ 'نظام' کے مدیر کے طور پر کی۔نظام میں نوکری سے قبل مصنف فیض صاحب کے اخبار 'امروز' میں نوکری کی خواہش رکھتے تھے۔اسی غرض سے ان کی ملاقات فیض صاحب سے ہوئی تھی۔مگر کسی وجہ سے فیض صاحب نے تھوڑا انتظار کرنے کو کہا۔انتظار کے اسی وقفے میں مصنف نے 'نظام' کی ادارت سنبھالی۔کچھ ہی

دنوں کے بعد انھیں فیض صاحب کے اخبار میں سب ایڈیٹر کی نوکری مل گئی ۔'امروز' میں لمبے عرصے (۱۹۴۹ء ۔ ۱۹۵۳ء) کی نوکری کے بعد مصنف نے فری لانسنگ شروع کر دی ۔گھر پر ہی بیٹھ کر اخباری کالم لکھتے اور اسے اخبار میں شائع کرواتے ۔ کچھ ہی دنوں بعد انھیں 'آفاق' میں نوکری مل گئی ۔آفاق کے ہفتہ وار خصوصی ایڈیشن مصنف کے ذمہ تھا۔لیکن آفاق کا وہ خصوصی ایڈیشن جلد ہی بند ہو گیا۔مصنف نے یہیں سے باقاعدہ کالم نگاری کی ابتداء کی اور گھر بیٹھے ہی کالم لکھ کر آفاق کے دفتر بھجوا دیتے ۔انھوں نے آفاق میں ۱۹۵۵ء ۔۱۹۵۷ء تک نوکری کی ۔

انتظار حسین نے کالم نگاری کی ابتداء 'خنداں' کے قلمی نام سے کی تھی ۔مگر بعد میں اپنے نام سے ہی کالم لکھنے لگے ۔مصنف کالم نویسی کے طور پر ۲۵ سال (۱۹۶۳ء سے ۱۹۸۸ء) تک روزنامہ 'مشرق' سے جڑے رہے ۔ مشرق سے جڑنے سے قبل مصنف کو گورمنٹ کالج لاہور سے بھی نوکری کی پیشکش آئی تھی ۔ڈاکٹر نذیر جو مصنف کے دوست تھے اسی کالج سے وابستہ تھے ۔ چنانچہ مصنف کے لیے انھوں نے کوشش کی مگر تنخواہ اتنی کم تھی کہ مصنف نے وہاں نوکری کرنا مناسب نہیں سمجھا ۔

> ''کوئی ڈیڑھ دو ہفتے کے بعد ڈاکٹر صاحب پھرٹی ہاؤس میں وارد ہوئے ۔تقرری کا پروانہ ہاتھ میں تھمادی ۔ادھر سوکھے دھانوں پر پانی پڑ گیا ۔گھر جب میں نے تنخواہ پر نظر ڈالی تو .... میں نے کہا ''ڈاکٹر صاحب ،جب میں نے صحافت میں قدم رکھا تھا اس وقت میری اس کے لگ بھگ تنخواہ مقرر ہوئی تھی ۔''
>
> بولے ''ہاں ۔ یہ تم نے ٹھیک دھیان دلایا ۔ چلو ہم ڈھائی تین Increment دلوا دیتے ہیں ۔
>
> یہ امید دلا ک---------- ۔ کہنے لگے یار ،یہ جواب یہاں سیکرٹری تعلیم لگا ہے وہ میری سنتا ہی نہیں ۔اصل میں میری اس سے کوئی یاد اللہ نہیں ۔کوئی صاحب ادھر ہی کے ہیں تمہاری طرف کے اس

سے کوئی سفارش نہیں لڑا سکتے۔

میں نے کہا'' ڈاکٹر صاحب، میں نے ادھر والے کی سفارش پر
بھروسہ کیا تھا۔ اب یہ بیچ میں کوئی ادھر والا آن ٹپکا۔ میں اس کے ل لیے
سفارش کہاں ڈھونڈتا پھروں۔'' ۲۰

اس کے بعد انھوں نے صحافت کو باقاعدہ روزگار کے طور پر اختیار کر لیا اور 'مشرق' سے جڑ گئے۔ 'مشرق' میں ۲۵ سالوں تک لکھتے رہے۔ مشرق کے بعد مصنف نے پھر فری لانسنگ شروع کر دی۔

انتظار حسین نے صحافت کے میدان میں صرف اردو میں خامہ فرسائی نہیں کی بلکہ وہ انگریزی اخباروں میں بھی کالم نگاری کے فرائض انجام دیتے رہے۔ انگریزی اخبار میں انھوں نے سب سے پہلے دیوجانس (Diogenes) کے نام سے Civil and Military لاہور میں ۱۹۶۲ء میں لکھنا شروع کیا۔ لاہور کے روزنامہ Frontier Post میں ۱۹۸۹ء سے فروری ۱۹۹۴ء تک ہفتہ وار کالم لکھتے رہے۔ اس کالم کا عنوان Point Counter Point تھا۔

انتظار حسین نے ۱۹۹۴ء میں روزنامہ Dawn کی ہفتہ وار اشاعت کے لیے Point of vew کے نام سے مستقل کالم لکھنا شروع کیا۔ بعد میں اس کا نام Literery Notes ہو گیا۔ اور یہ سلسلہ ۲۰۱۵ء تک جاری ہرا۔ آخری عمر تک روزنامہ ایکسپریس سے جڑے رہے ان کا آخری کالم ۲۵ جنوری ۲۰۱۶ء کو شائع ہوا۔ جو انھوں نے بیماری سے قبل ۲۳ جنوری کو لکھا تھا۔ روزنامہ ایکسپریس نے انتظار حسین کے انتقال کے بعد ان کی آخری تحریر کا عکس ۳ فروری ۲۰۱۶ء کو شائع کیا۔

انتظار حسین نے اخباروں میں کالم لکھنے کے علاوہ مختلف رسائل کی ادارت بھی کی۔ انھوں نے بحیثیت مدیر 'خیال' کی ادارت کی۔ خیال کے صرف تین شمارے ہی شائع ہو سکے۔ مگر ناصر کاظمی کے اشتراک سے خیال کا ایک یادگار نمبر ۱۸۵ کے نام سے نکالا۔ خیال کا نمبر ۱۸۵۷ء نمبر آج بھی اپنے آپ میں ایک مثال ہے۔ یہ شمارہ ۱۸۵۷ء کی صدی کے موقع پر ۱۹۵۷ء میں نکالا گیا تھا۔ اس میں مختلف مصنفوں، شعراء اور مصوروں سے مدد لی گئی تھی

۔ بعد میں اس نمبر کو کتابی شکل میں بھی شائع کیا گیا۔

خیال کے علاوہ مصنف نے لمبے عرصے تک ' ادب لطیف' کی ادارت بھی کی ۔ ادب لطیف ،ترقی پسند تحریک کا خاص رسالہ تھا،مگر مصنف نے اس کی ادارت اپنی شرائط اور طریقے سے کی ۔ اکتوبر ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۵ء تک انتظار حسین نے ادب لطیف کی ادارت کی ۔

وفات:

انتظار حسین کا انتقال ۹۲ سال کی عمر میں ۲ فروری ۲۰۱۶ء کو لاہور میں ہوا ۔۲۲ جنوری کے دن وہ دوستوں کے ساتھ ٹہلنے نکلے واپس آنے کے بعد غسل کیا ۔اس کے بعد انھیں بخار کا احساس ہونے لگا ۔ دوا کھائی مگر افاقہ نہ ہوا ۔ اگلے دن بھی یہی حالت رہی ۔ ملاقات کرنے آئے دوستوں نے ہسپتال جانے کا مشورہ دیا مگر انھوں نے منع کر دیا ۔اس کے اگلے دن ہی ان کی طبیعت زیادہ بگڑ گئی ۔ان پر بے ہوشی طاری ہوگئی ۔ان کے خادم ہارون نے ایرج مبارک کو فون پر اطلاع دی جنھوں نے ۲۶ جنوری کے دن ڈیفنس نیشنل ہسپتال میں داخل کرایا ۔ڈاکٹروں کی تمام کوششوں کے باوجود انھیں ہوش میں لانا ممکن نہ ہو سکا ۔اسی حالت میں ۲ فروی ۲۰۱۶ء پیر کے دن انتظار حسین اس دار فانی سے کوچ کر گئے ۔ان کے جسد خاکی کو فردوسیہ قبرستان ، فیروز پور روڈ میں ۳ فروری بعد نماز ظہر دفن کیا گیا۔

(ب) ادبی خدمات انعامات واعزازات

ادبی زندگی کا آغاز:

انتظار حسین نے اپنے بچپن میں ہی گھر میں موجود اردو کی مختلف کتابوں کے مطالعے سے دلچسپی پیدا کر لی تھی۔ جو وقت کے ساتھ ساتھ پروان بھی چڑھ رہی تھی۔ ان کے والد ان کو عربی پڑھانے کی کوشش کرتے رہے مگر یہ چھپ چھپ کر اردو کی کتابیں پڑھتے رہے۔ انھوں نے اپنے مطالعہ کی ابتدا اپنے ہی گھر میں موجود ''الف لیلیٰ'' اور والد کے کتب خانے سے دیگر ادبی و مذہبی کتابیں پڑھ کر کی۔ بقول انتظار حسین۔

> ''گھر میں جب آ تا تھا تو ایک کتاب تھی پیلے ورقوں والی، اور اس میں کچھ جادوگروں کی تصویریں، کچھ جنوں، تو وہ میں نے پڑھنی شروع کر دی، رفتہ رفتہ پتہ چلا کی اسے ''الف لیلہ'' کہتے ہیں۔ کچھ مرے والد کا کتب خانہ تھا چھوٹا سا۔۔۔۔۔۔۔ میں نے وہ مذہبی کتابیں بھی پڑھ ڈالیں۔'' [۲۱]

اس طرح انتظار حسین نے اپنی ابتدائی دور میں اردو کتابوں کا مطالعہ شروع کیا چونکہ ان کے گھر کا ماحول مذہبی زیادہ اور ادبی کم تھا پھر بھی ان کے یہاں پرانے رسائل و جرائد رہتے تھے۔ جن کا مطالعہ انھوں نے بڑی گہرائی سے شروع کر دیا تھا۔ انتظار حسین کے ساتھ ان کے ماموں زاد ایک بہن بھی تھی جن کو چھوٹے بچے بی بی آپا کہتے تھے۔ ان کے نام سے ماہنامہ ''عصمت'' آتا تھا جس میں علامہ راشد الخیری کے ناول بھی قسط وار شائع ہونے لگے تھے۔ مصنف نے ماہنامہ 'عصمت' کے گوشوں کا خوب مطالعہ کیا۔ اور اپنے بچپنے میں ہی راشد الخیری کے ناولوں کو جو اس رسالے میں شائع ہوتے تھے پڑھ لیا تھا۔ انتظار حسین کے ادبی ذہن سازی میں ماہنامہ عصمت کا بھی بڑا

رول رہا ہے۔

میرٹھ آنے کے بعد مصنف نے باقاعدہ ادب پڑھنا شروع کیا۔ بی اے اور ایم اے کے دوران انھوں نے ادب کے کئی فن پاروں اور شخصیتوں کا مطالعہ کیا۔ ادب میں بدلتے رجحانات پر بھی ان کی خاص اسی زمانے میں پڑی۔ علامہ اقبال، میرا جی، فیض احمد فیض، کرشن چندر، غلام عباس، وغیرہ سے کافی متاثر ہوئے۔ انتظار حسین خاص طور سے میرا جی سے کافی متاثر تھے۔ ان سے اثر لے کر مصنف نے شاعری میں قدم رکھا تھا مگر اس راستے میں وہ زیادہ دن نہیں چل سکے۔ حالاں کہ انھوں نے کئی آزاد نظمیں تحریر کی تھی مگر ان نظموں کو محفوظ رکھنا ضروری نہیں سمجھا۔ میرا جی سے متاثر ہونے کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب انھیں انھیں فرانس کی حاکومت کی جانب سے ادبی انعام دیا جانے لگا تو انھوں نے اپنی تقریر کے دوران اس نعام کو، میرا جی، منٹو اور حصن عسکری کی کا فیض بتایا۔

انتظار حسین افسانہ نگار نہیں بلکہ نقاد بننے کی خواہش رکھتے تھے۔ اور افسانہ نگاری کا میدان اپنے دوست ریوتی سرن شرما کے لیے چھوڑ رکھا تھا۔ ابتداء میں انھوں نے آزاد نظمیں لکھیں لیکن جلد ہی وہ شاعری سے افسانہ نگار ی کی طرف آ گئے۔

انھوں نے اپنی پہلی کتاب تقسیم ہند سے قبل مکمل کر لی تھی جس کا موضوع لسانیات تھا۔ ایم اے کے دوران ان کو لسانیات سے دلچسپی ہو گئی تھی۔ اس لیے انھوں نے لسانیات سے متعلق ایک پوری کتاب لکھ ڈالی۔ وہ اس کتاب کے مسودے کو مولوی عبدالحق کے پاس لے کر گئے جنھوں نے مسودے کو ریاض الحسن کو دکھانے کا مشورہ دیا۔ ریاض الحسن نے اس میں تھوڑی ترمیم و اضافہ کا مشورہ دیا۔ مگر اس کے بعد اس کتاب کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔ اس کتاب کے بعض حصے دو مضامین کی صورت میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے رسالہ ''جامعہ'' میں شائع بھی ہوئے۔ ان دو مضامین میں پہلا اپریل ۱۹۴۶ء میں 'قواعد کی ابتدا' کے نام سے اور دوسرا ''تقابلی لسانیات کا نیا طریقہ کار'' کے عنوان سے اگست ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا۔

انتظار حسین نے مضمون نگاری آغاز چھوٹے چھوٹے مضامین لکھ کر کیا۔ ان کے یہ مضامین رسائل و جرائد

میں چھپتے رہے۔ایم اے کے دوران ان کا رجحان تنقید کی طرف پیدا ہوگیا۔اس کے بعد وہ پروفیسر کرار حسین کے ہفت روزہ 'الامین' میں باقاعدہ طور سے مضامین لکھنے لگے تھے۔ان کی سب سے پہلی تحریر تنقیدی مضمون کے طور پر سامنے آئی۔یہ مضمون کرشن چندر کے بھائی ،مہیندر ناتھ کے افسانوی مجموعے پر تھا جو ممبئی کے ہفتہ وار 'نظام' میں شائع ہوا۔انتظار حسین نے مختلف مواقع پر اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ وہ ناقد بننا چاہتے ہیں۔اور تنقیدی مضامین لکھنا بھی شروع کر دیا تھا۔مگر تقسیم کے ہنگامے سے متاثر ہوکر انھوں نے ایک تحریر لکھی جس سے ان کو اندازہ ہوا کہ ان کے اندر تو ایک افسانہ نگار چھپا ہے۔مہیندر ناتھ سے ملاقات اور اپنے پہلے مضمون کے سلسلے میں انتظار حسین نے اس طرح تفصیل بیان کی ہے:

''ڈیڑھ دو گھنٹے کی ملاقات میں۔۔۔جیسے واقعی دوستی کا رشتہ
قائم ہوگیا ہو۔انہیں دنوں ۔۔مجموعہ ''چاندی کے تار'' کے نام سے
۔۔۔۔۔۔کھا کر اور بھی اچھے ہوگئے۔میں تنقید لکھنے۔۔۔سوچا کہ اسی
کتاب سے بسم اللہ کی جائے اور مضمون فوراً ہی چھپ گیا بمبئی کے ہفتہ
وار پرچہ 'نظام' میں۔'' ۲۲

۱۹۴۷ء میں جب ہندستان سے لوگ جوق در جوق پاکستان روانہ ہونے لگے تو شہر کا شہر خالی ہوگیا جس سے ہاپوڑ ،میرٹھ اور دیگر علاقے بھی متاثر ہوئے۔چوک چوراہے پر بھی سناٹا چھانے لگا اور گھروں میں تالے پڑنے لگے۔اس پرآشوب ماحول میں زندگی و معاشرے کے بدلتے رویے سے متاثر ہوکر انھوں نے ایک تحریر لکھی جس کے بعد انھیں اندازہ ہوا کہ ان کے اندر ایک افسانہ نگار چھپا ہے۔اس سلسلے میں انھوں نے لکھا ہے۔

''اردگرد کی فضا دیکھ کر میں نے ایک روز قلم سنبھالا لکھنے بیٹھ گیا
جب لکھ چکا تو میں نے اپنی تحریر کو رک رک کر پڑھا۔ارے یہ تو میں نے
افسانہ لکھا ہے۔جب مجھے احساس ہوا کہ میں ادب میں کہاں کہاں منہ مار
رہا ہوں۔میں اگر کچھ لکھ سکتا ہوں تو وہ افسانہ ہے۔'' ۲۳

انتظار حسین نے ۲۲ سال کی عمر میں اپنا پہلا افسانہ ۱۹۴۷ء میں میرٹھ میں بیٹھ کر لکھا۔ اس ابتدائی افسانے کا نام 'قیوما کی دکان'' ہے جو 'ادب لطیف' لاہور کے دسمبر ۱۹۴۸ء میں پہلی بار شائع ہوا۔ یہیں سے ان کی ادبی زندگی کا آغاز پوری طرح ہو جاتا ہے۔

لاہور کے قیام کے بعد انتظار حسین نے لاہور کو میرٹھ سے بڑھ کر اپنی ادبی شناخت کا حصہ بنایا۔ ان تمام باتوں کی تفصیل انھوں نے ''چراغوں کا دھواں'' میں بیان کی ہے۔ وہ لاہور کے ایک بڑے وقائع نگار بن گئے اور یہاں کے بدلتے موسم، احباب، ادباء کے جم گھٹے کا ایک حسین گلدستہ اور ادیب حضرات کا ایک نگار خانہ تیار کیا۔ انھوں نے وہاں حلقہ ارباب ذوق میں شامل ہونے کے بعد بطور اسسٹنٹ سکریٹری کام بھی کیا۔ اس طرح انتظار حسین نے پاکستانی تخلیق کاروں کے درمیان خوب شہرت حاصل کی۔ ان کو لاہور میں ادیبوں کی ایک بہترین جماعت مل گئی اور پھر وہ اپنی تخلیقی کاموں میں پوری زندگی بڑی دلچسپی کے ساتھ جڑے رہے۔

انتظار حسین کے سینئر احباب میں قیوم نظر، سراج احمد، شہرت بخاری، انجم رومانی، اعجاز بٹالوی، یوسف ظفر، مختار صدیقی، ضیا جندھری، امجد الطاف، شیر محمد اختر وغیرہ تھے۔ اس کے بعد ان کے ہم عصر ادیبوں کی ایک کھیپ نکل کر سامنے آئی جن میں ناصر کاظمی، مظفر علی سید، احمد مشتاق، غالب احمد، شاہد حمید، حنیف رامے، صلاح الدین، شاکر علی، سعید محمود، ظفر صمدانی، سجاد باقر رضوی وغیرہ تھے۔

ادبی کانامے:

انتظار حسین اردو کے ایک نامور افسانہ نگار اور ناول نگار ہیں۔ جن کو بیسویں صدی کے نمائندہ فکشن نگاروں میں اہم مقام حاصل ہے۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''گلی کوچے'' ہے جو ۱۹۵۲ء میں شاہین پبلشرز، لاہور سے شائع ہوا۔ اس مجموعے میں ان کا پہلا افسانہ ''قیوم کی دکان'' بھی ہے جو ''ادب لطیف'' لاہور میں ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اس اوّلین مجموعے میں کل گیارہ افسانے شامل ہیں جن کی ترتیب یوں ہے:

(۱) استفسار (۲) قیوما کی دکان (۳) خرید و حلوا بین کا (۴) چوک (۵) فجا کی

آپ بیتی (۶) اجودھیا (۷) رہ گیا شوقِ منزلِ مقصود (۸) پھر آئے گی (۹) عقیلہ خالہ (۱۰) روپ نگر کی سواریاں (۱۱) ایک بن لکھی رزمیہ۔

ایک رپورتاژ ''ساجھی بھئی چوندیسی'' اور ایک کہانی 'استاذ' کے نام سے بھی اس مجموعے کا حصہ ہے۔

دوسرا افسانوی مجموعہ ''کنکری'' کے نام سے ۱۹۵۵ء میں مکتبہ جدید لاہور سے منظر عام پر آیا اس میں کل چودہ افسانے ہیں۔ترتیب کچھ یوں ہے:

(۱) انجہاری کی گھریا (۲) مجمع (۳) اصلاح (۴) محل والے (۵) یاں آگے درد تھا (۶) آخری موم بتی (۷) دیولا (۸) کیلا (۹) ساتواں در (۱۰) پٹ بیچنا (۱۱) پسماندگان (۱۲) ٹھنڈی آگ (۱۳) جنگل (۱۴) مایا (۱۵) کنکری

موصوف کا تیسرا مجموعہ ''آخری آدمی'' ہے جو ۱۹۶۷ء میں کتابیان لاہور سے زیورِ طباعت سے آراستہ ہوا۔اس مجموعے کی اشاعت نے انتظار حسین کو ادبی حلقوں میں معروف کر دیا۔ان کے شاہکار افسانے 'آخری آدمی' اور 'زرد کتا' اس مجموعے کی زینت ہیں۔یہ مجموعہ ذیل میں دیے گیارہ افسانوں پر مشتمل ہے۔

(۱) آخری آدمی (۲) زرد کتا (۳) پرچھائیں (۴) ہڈیوں کا ڈھانچہ (۵) ہمسفر (۶) کایا کلپ (۷) ٹانگیں (۸) سکنڈ راؤنڈ (۹) سوئیاں (۱۰) شہادت (۱۱) سوت کے تار

چوتھا افسانوی مجموعہ ''شہر افسوس'' ہے جو ۱۹۷۲ء میں مکتبہ کارواں لاہور سے شائع ہوا۔اس مجموعے میں کئی اہم افسانے شامل ہیں جو بعد میں انتظار حسین کی مزید اہمیت اور شہرت کا باعث ہوئے۔مثلاً ''وہ جو کھوئے گئے''، ''وہ جو دیوار کو نہ چاٹ سکے''، ''شہر افسوس'' اور ''کٹا ہوا ڈبا''۔اس میں کل سترہ افسانے ہیں۔

(۱) وہ جو کھوئے گئے (۲) کٹا ہوا ڈبہ (۳) دہلیز (۴) سیڑھیاں (۵) مردہ راکھ (۶) مشکوک لوگ (۷) شرم الحرم (۸) کانا دجال (۹) بگڑی گھڑی (۱۰) دوسرا گناہ (۱۱) دوسرا راستہ (۱۲) اپنی آگ کی طرف (۱۳) لمبا قصہ (۱۴) وہ اور میں (۱۵) وہ جو

دیوار کو نہ چاٹ سکے (۱۶) اندھی گلی (۱۷) شہر افسوس۔

پانچواں افسانوی مجموعہ ''کچھوے'' ہے کو ۱۹۸۱ء میں مطبوعات لاہور سے شائع ہوا۔ یہ مجموعہ سترہ افسانوں پر مشتمل ہے جس کی ترتیب اس طرح سے ہے۔

(۱) قدامت پسند لڑکی (۲) ۳۱ مارچ (۳) فراموش (۴) بادل (۵) اسیر (۶) ہندستان سے ایک خط (۷) نیند (۸) کچھوے (۹) پتے (۱۰) واپس (۱۱) رات (۱۲) دیوار (۱۳) خواب اور تقدیر (۱۴) شور (۱۵) صبح کے خوش نصیب (۱۶) بے سبب (۱۷) کشتی۔

چھٹا افسانوی مجموعہ ''خیمے سے دور'' ۱۹۸۶ء میں سنگ میل پبلی کیشنز لاہور سے زیور طباعت سے آراستہ ہو کر ادبی حلقوں کی زینت بنا۔ یہ مجموعہ بھی سترہ افسانوں پر مشتمل ہے۔

(۱) خیمے سے دور (۲) سفرِ منزل شب (۳) حصار (۴) نرناری (۵) پورا گیان (۶) دھوپ (۷) برہہ کی کہانی (۸) اجنبی پرندے (۹) برہمن بکرا (۱۰) وقت (۱۱) انتظار (۱۲) پلیٹ فارم (۱۳) چیلیں (۱۴) پرانی کہانی (۱۵) دسواں قدم (۱۶) خالی گھر (۱۷) خواب میں دھوپ۔

ساتواں مجموعہ ''خالی پنجرہ'' کے نام سے ۱۹۹۳ء میں سنگ میل پبلی کیشنز لاہور سے شائع ہوا اس میں سترہ افسانے ہیں جن کی ترتیب اس طرح سے ہے:

(۱) پچھتاوا (۲) نرالا جانور (۳) تعلق (۴) خالی پنجرہ (۵) اختر بھائی (۶) مشکند (۷) گونڈوں کا جنگل (۸) بندر کہانی (۹) طوطے مینا کی کہانی (۱۰) بخت مارے (۱۱) داغ اور درد (۱۲) تذکرۂ رستخیز بے جا المعروف بہ فسانۂ عبرت (۱۳) احسان منزل (۱۴) مجیدا (۱۵) بیریم کاربونیٹ (۱۶) سمجھوتہ (۱۷) آخری خندق۔

آٹھواں اور .... افسانوی مجموعہ ''شہر زاد کے نام سے ۲۰۰۲ء میں سنگ میل پبلی کیشنز لاہور سے طباعت

کے زیور سے آراستہ ہوااوراس میں سترہ افسانے شامل ہیں۔ترتیب اس طرح سے ہے:

(۱) دائرہ (۲) مورنامہ (۳) شہزادکی موت (۴) ریزروسیٹ (۵) وارد ہونا شہزادہ تورج کا شہر کا غذاباد میں اور عاشق ہونا ملکہ قرطاس جادو پر (۶) ہم نوالہ (۷) مانوس اجنبی (۸) اللہ میاں کی شہزادی (۹) جبالا کا پوت (۱۰) کلیلہ نے دمنہ سے کیا کہا (۱۱) دمنہ کیوں ہنسا کلیلہ کیوں رویا (۱۲) کلیلہ دمنہ ہٹ لسٹ پر (۱۳) کلیلہ چپ ہوگیا (۱۴) چوہیا نے کیا کھویا کیا پایا (۱۵) مہابن کے بندروں کا قصہ (۱۶) میرے اور کہانی کے بیچ (۱۷) شہزاد کے نام۔

ان کے افسانوں کی دوکلیات ''جنم کہانیاں'' ۱۹۸۷ء اور ''قصہ کہانیاں'' ۱۹۹۰ء اور اب ان کے تمام افسانوں کا مجموعہ بہ نام ''مجموعہ انتظار حسین'' ۲۰۰۷ء میں سنگ میل پبلی کیشنز لاہور سے منظر عام پر آیا جو نو افسانوی مجموعوں پر مشتمل ہے۔

انتظار حسین کا نام غیر افسانوی ادب میں بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔انھوں نے ترجمہ نگاری، روداد نگاری، مضمون نگاری، سفرنامے، سوانح نگاری، یادداشتیں، ڈرامہ نگاری، ترتیب و تراجم، ٹی وی اسکرپٹ رائٹنگ کے ذریعے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔فکشن سے متعلق ان کے تراجم میں ''نئی پود'' روسی ناول نگار ترگنیف کے ناول "Father and sons" کا ترجمہ ہے جو ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا۔اس کے بعد ایک امریکی ادیب اسٹیفن ولنسٹٹ بینٹ کی چار کہانیوں ''شیطان اور دانیال''، ''وپسٹر''، ''پڑوسی''، ''ناؤ'' اور ''سالگرہ'' کے عنوان سے کیے ہیں کو اردو کے بہترین تراجم ہیں۔اس میں شامل کہانی ''شیطان اور دانیال'' اور وپسٹر کو متعدد بار فلمایا بھی جا چکا ہے۔سرخ تمغے امریکی ناول نگار اسٹیفن کرین کے ناول "The Red Badge of" کا ترجمہ ہے جو ۱۹۶۰ء میں شائع ہو چکا۔فلسفے کی نئی تشکیل جان ڈیوی کی کتاب کا مشہور ترجمہ ہے۔اس کے علاوہ ایلسن ڈیلیگشن کے ناول کا ترجمہ ''سارہ کی بہادری'' کے نام سے کیا ہے جو ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا اس کے علاوہ انھوں نے ''گھاس کے میدانوں میں'' مشہور روسی مصنف 'چیخوف' کے ناول "Steppe" کے انگریزی ترجمے کا ترجمہ ہے، جو ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا۔''سعید کی خفیہ زندگی'' "The secret life of Saeed" کا ترجمہ ۱۹۹۹ء اور ''شکستہ ستون پر

دھوپ'' عطیہ عابد حسین کے ناول "Sunlight On Broken Beam" کا ترجمہ ہے ۔''ہزار داستان'' ''الف لیلیٰ'' کا بہترین ترجمہ ہے۔اسلامی ثقافت "Islamic Tradition" کا ترجمہ ہے ۔

انتظار حسین نے اپنے سفر ناموں کے ذریعے بھی ادبی حلقوں میں کافی مقبولیت حاصل کی ہے۔''زمین اور فلک'' یہ ان کے تین سفر ناموں ''بندر کی دم'' ، ''مور کی تلاش'' اور''زمین اور فلک'' پر مشتمل ہے۔ یہ ۱۹۸۴ء میں شائع ہونے کے بعد''دھوں چھاؤں'' لکھا اور پھر اس کے بعد انھوں نے اپنے چوتھے سفر کی روداد دو قسطوں میں 'سویرا' میں ''اے آبِ درد جمنا'' اور ''داستانے از دکن آوردہ ام'' کے عنوان سے لکھی جو شائع بھی ہو چکی ہیں ۔پھر انھوں نے بڑی تاخیر کے بعد ایک بہترین فکشن نما سفر نامہ''جستجو کیا ہے '' کے عنوان سے لکھا جو سفر نامہ کم خود نوشت سوانح زیادہ ہے۔ جو ۲۰۱۲ء میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے اشاعت پذیر ہوا ۔موصوف نے''چراغوں کا دھواں'' کے عنوان سے ایک اور سوانح عمری قلم بند کی ہے۔ جو ۱۹۹۹ء میں سنگ میل پبلی کیشنز لاہور سے شائع ہو چکا ہے۔اس کے علاوہ''دلی تھا جس کا نام''، ''نیا گھر'' ، ''اپنی دانست میں'' ان کی بہترین یاداشتیں ہیں۔انتظار حسین نے اپنے ڈراموں کے ذریعے بھی اپنی ہنر مندی کا ثبوت پیش کیا ہے۔انھوں نے ٹی وی ڈرامے، اسٹیج ڈرامے، ریڈیو لکھے ہیں۔''خوابوں کے مسافر'' ۱۹۶۸ء ان کا اسٹیج ڈرامہ ہے۔''نفرت کے پردے میں'' ۱۹۷۰ء''پانی کے قیدی'' ٹی وی ڈرامہ ہے۔ جو مطبوعہ سویرا کراچی شمارہ ۴۶/اکتوبر ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا۔انتظار حسین کے ان ڈراموں نے صرف ادبی ڈرامے کی اہمیت وخصوصیت سے واقفیت حاصل کی بلکہ معاشرے کی اصلاح اور تہذیبی روایت کی پاسداری نیز اس کے ناظرین وسامعین خوب محظوظ ومسرور بھی ہوئے۔

انتظار حسین نے ادبی دنیا میں بطور مرتب بھی نمایاں کام کئے ہیں جس کی وجہ سے ان کی ادبی طور پر ایک شناخت قایم ہوئی ہے۔''سن ستاون میری نظر میں'' خیال نمبر ترتیب بہ اشتراک ناصر کاظمی ۱۹۵۹ء اس کے علاوہ انھوں نے''سرشار کی الف لیلیٰ'' ۱۹۶۱ء ''عظمت کے گہوارے میں'' ۱۹۷۴ء'' کچھ تو کہیے'' ۱۹۶۳ء ''کلیلہ دمنہ'' جو بچوں کی کہانیوں پر مشتمل ہے ۱۹۷۹ء'' قاعد اعظم کے ابتدائی حالات'' ۱۹۹۲ء ''انشاء اللہ خان کی دو کہانیاں'' بھی مرتب کی ہیں اس کے علاوہ وہ حکیم اجمل کی سوانح عمری''اجمل خان''، ''سنگھاسن بستی''، ''پاکستانی

کہانیاں'' جو پاکستان کے پچاس سالہ افسانوں پر محیط ہے جو انتظار حسین اور آصف فرخی نے مل کر مرتب کی ہے۔'' ماوزے تنگ'' بھی انھوں نے مرتب کی ہے۔

انتظار حسین نے چار ناول اور ایک ناولٹ جن میں ا۔ چاند گہن ۱۹۵۳ء، ۲۔ دن اور داستان (ناولٹ) ۱۹۶۲ء، ۳۔ بستی ۱۹۸۰ء، ۴۔ تذکرہ ۱۹۸۷ء اور ۵۔ آگے سمندر ہے ۱۹۹۵ء بھی سپرد قلم کر کے ادبی حلقوں میں اپنا نام کمایا۔

تنقید کے میدان میں بھی انھوں نے طبع آزمائی کی ہے اور فکشن تنقید سے متعلق بہترین تنقید لکھی ہے۔ افسانوی مجموعہ'' آخری آدمی'' میں اپنے کرداروں کے بارے میں'' شہر افسوس'' میں ''کہانی کی کہانی''، '' کچھوے'' میں ''نئے افسانہ نگار کے نام''، ''افسانہ میں چوتھا کھونٹ''، ڈیڑھ بات اپنے افسانے پر''، '' قصہ پارینہ'' جیسے مضامین ہیں۔ ان کی دو تنقیدی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ پہلی'' علامتوں کا زوال'' ۱۹۸۳ء سنگ میل پبلی کیشنز لاہور سے اور دوسری کتاب'' نظریے سے آگے'' ۲۰۰۴ء سنگ میل پبلی کیشنز لاہور سے جس نے ادبی دنیا میں فکشن تنقید سے متعلق کافی شہرت حاصل کی ہے۔ اس کے علاوہ'' اپنی دانست میں'' ۲۰۱۴ء میں اسی پریس سے اشاعت پذیر ہوئی۔

انتظار حسین نے اپنے دوستوں کے بہترین خاکے بھی لکھے ہیں۔'' چار گھڑی یادوں کا میلہ''، ''ہجرت کی رات کا ستارہ'' ناصر کاظمی کا خاکہ ہے۔ انھوں نے ناصر کاظمی کا ایک اور خاکہ طنز و مزاح کے انداز میں لکھا ہے جو'' شادی اور موت'' کے عنوان سے ہے۔ مطبوعہ فنون'' شیخ صلاح الدین'' جو ابھی غیر مطبوعہ ہے۔'' شاکر صاحب'' ان کے دوست' مصور شاکر'، پرنسپل نیشنل کونسل آف دی آرٹس کا خاکہ ہے۔'' یارِ عزیز'' جمیل جالبی کا خاکہ ہے۔ '' قیوم نظر کا قہقہہ'' قیوم نظر کا خاکہ ہے،'' کالج سے گھر تک'' حسن عسکری کا خاکہ ہے۔

ادبی تخلیقات کی فہرست :

افسانوی مجموعے:

۱۔ گلی کوچے	۱۹۵۲ء	(گیارہ افسانے) شاہین پبلشرز لاہور
۲۔ کنکری	۱۹۵۵ء	(چودہ افسانے) مکتبہ جدید، لاہور
۳۔ آخری آدمی	۱۹۶۷ء	(گیارہ افسانے) کتابیات، لاہور
۴ ۔ شہرافسوس	۱۹۷۲ء	(سترہ افسانے) مکتبہ کارواں، لاہو
۵۔ کچھوے	۱۹۸۱ء	(سترہ افسانے)مطبوعات، لاہور
۶۔ خیمے سے دور	۱۹۸۶ء	(سترہ افسانے) سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور
۷۔ خالی پنجرہ	۱۹۹۳ء	(سولہ افسانے) سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور
۸۔ شہرزاد کے نام	۲۰۰۲ء	(پندرہ افسانے) سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور
۹۔ نئی پرانی کہانیاں	۲۰۰۶ء	(انتالیس افسانے) سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

انتظار حسین کے افسانوں کی کلیات ''جنم کہانیاں'' ۱۹۸۷ء اور ''قصہ کہانیاں'' ۱۹۹۰ء کے نام دو جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔ ۲۰۰۷ء میں ''مجموعہ انتظار حسین'' کے نام سے ان کے افسانوں کی کلیات آئی جو نو افسانوی مجموعوں پر مشتمل ہے۔

ناول اور ناولٹ:

(۱) چاند گہن	۱۹۵۳ء	مکتبہ کارواں، لاہور
(۲) دن اور داستان	۱۹۶۲ء	ادارہ ادبیات نو، لاہور
(۳) بستی	۱۹۸۰ء	کتاب گھر، لاہور
(۴) تذکرہ	۱۹۸۷ء	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور
(۵) آگے سمندر ہے	۱۹۹۵ء	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

تنقیدی مجموعے:

علامتوں کا زوال	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور
نظریے سے آگے	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور
اپنی دانست میں	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

سوانح کتب:

قائداعظم	ٹیکسٹ بورڈ، لاہور ۱۹۷۶ء
اجمل اعظم	یادگار اجمل، لاہور۔ ۱۹۹۵ء
دلی تھا جس کا نام	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۳ء

سفرنامے:

زمین اور فلک اور	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور
نئے شہر پرانی بستیاں	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

خودنوشت سوانحی عمری:

جستجو کیا ہے	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور
چراغوں کا دھوں	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

ڈرامہ نگاری:

خوابوں کے مسافر	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

صحافت/کالموں کے مجموعے:

ذرّے	پاکستان فاؤنڈیشن، لاہور۔ ۱۹۷۶ء

باتیں اور ملاقاتیں	مکتبہ عالیہ، لاہور
بوند بوند	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۴ء
قطرے میں دریا	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

تراجم۔افسانوی:

نئی پود از ایوان ترگنیف	مکتبہ اردو، لاہور ۱۹۵۲ء
ناؤ اور دوسرے افسانے	آئینہ ادب، لاہور ۱۹۵۸ء
سرخ تمغہ از اسٹیفن کرین و دیگر	یونائیٹڈ بک ڈپو، لاہور ۱۹۶۰ء
سارہ کی بہادری از ایلس ڈیلگیش	شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور ۱۹۲۳ء
ہماری بستی از تھارنٹن وائلڈر (ڈرامہ)	اردو اکیڈمی، سندھ، کراچی، ۱۹۶۷ء
گھاس کے میدانوں میں، از چیخوف	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۹۰ء
شکستہ ستون پر دھوپ	مشعل، لاہور، ۱۹۹۷ء
سعید کی پراسرار زندگی از ایمل حبیبی	انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۹۹ء

تراجم۔(غیر افسانوی)

فلسفے کی نئی تشکیل۔از جان ڈیوی	شیش محل کتاب گھر، لاہور ۱۹۶۱ء
ماؤزے تنگ از اسٹیوارٹ شریم	نگارشات، لاہور، ۱۹۲۲ء
اسلامی ثقافت	ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور ۱۹۹۶ء

تدوین:

لطیفے اور چٹکلے	مکتبہ کارواں، لاہور

الف لیلیٰ از رتن ناتھ سرشار	شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور ۱۹۶۱ء
کچھ تو کہیے	مکتبہ جدید۔ لاہور، ۱۹۶۳ء
انشاءاللہ خان انشا کی دو کہانیاں	مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۱ء
سن ستاون میری نظر میں (بہ اشتراک ناصر کاظمی)	آئینہ ادب، لاہور، ۱۹۵۷ء
پاکستانی کہانیاں (بہ اشتراک آصف فرّخی)	ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی۔ ۱۹۹۸ء
عظمت کے گہوارے میں	پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور ۱۹۷۴ء
سوالات وخیالات از کرار حسین	فضلی سنز پرائیوٹ لمٹیڈ، کراچی، مئی ۱۹۹۹ء
سنگھاسن بتیسی	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۱۴ء
سخن اور اہل سخن از مظفر علی سید	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۱۶ء

بچوں کی کتابیں:

کلیلہ دمنہ	یونیورسٹی گرانٹس کمیشن، اسلام آباد ۱۹۷۹ء
الو اور کوا	اوکسفوڈ یونیورسٹی، پریس، کراچی ۲۰۰۱ء

انتظار حسین پر خصوصی تحریریں اور خصوصی گوشہ:

۱۔ دوماہی 'الفاظ' علی گڑھ، خصوصی شمارہ، مئی اگست ۱۹۸۶ء

۲۔ ماہ نامہ 'کتاب نما' نئی دہلی، خصوصی شمارہ، مئی ۱۹۹۲ء

۳۔ انتظار حسین اور اس کے افسانے، مرتبہ گوپی چند نارنگ۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۷۴ء

۴۔ گنی چنی کہانیاں وکاس پبلیشنگ ہاؤس، نئی دہلی ۱۹۹۲ء

۵۔ گنی چنی تحریریں۔ مرتبہ آصف فرخی، سنگ میل پبلی کیشنز۔ لاہور ۲۰۰۶ء

۶۔ انتظار حسین ایک دبستان، مرتبہ ارتضیٰ کریم۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی ۱۹۹۶ء

۸۔ چراغ شب افسانہ۔آصف فرخی۔سنگ میل پبلی کیشنز۔لاہور ۲۰۱۶ء

ہندو پاک میں انتظار حسین پر لکھے گئے تحقیقی مقالات:

۱۔ انتظار حسین کی افسانہ نگاری۔سائرہ بانو۔شعبہ اُردو بہاء الدین ذکریا یونی ورسٹی ۱۹۸۱ء

۲۔ انتظار حسین کی ناول نگاری،سہیل ممتاز۔یونی ورسٹی آف اورینٹل کالج پنجاب یونی ورسٹی،لاہور ۱۹۹۶ء

۳۔ انتظار حسین کی غیر افسانوی نثر۔فیاض احمد۔یونی ورسٹی آف اورینٹل کالج پنجاب یونی ورسٹی،لاہور ۱۹۹۴ء

۴۔ انتظار حسین کی ناول تذکرہ کا تنقیدی مطالعہ۔ابرار احمد۔جواہر لال یونی ورسٹی،دہلی ۲۰۱۰ء

۵۔ انتظار حسین کی ادبی خدمات کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ۔ابرار احمد۔جواہر لال یونی ورسٹی،دہلی ۲۰۱۶ء

۶۔ انتظار حسین کی افسانہ نگاری۔اعظم میر۔چودھری چرن سنگھ یونی ورسٹی۔یوپی

۷۔ انتظار حسین کے ناولوں کا تنقیدی محاکمہ۔عبدالباسط،علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی ۲۰۱۴ء

۸۔ انتظار حسین کی غیر افسانوی تحریروں کا تنقیدی مطالعہ۔ عبدالباسط،علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی ۲۰۱۸ء

۹۔ انتظار حسین کے افسانوں کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ۔حامد رضا صدیقی۔علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی ۲۰۱۷ء

۱۰۔ انتظار حسین کے افسانوں میں علامت نگاری۔محمد نعیم۔وَنی ورسٹی آف اورینٹل کالج پنجاب یونی ورسٹی،لاہور ۲۰۰۴ء

۱۱۔ انتظاحسین کے ناولوں میں ہنددیومالائی عناصر ،رابعہ بانو ، یونی ورسٹی آف جموں ،۲۰۱۷ء

۱۲۔ دوناولٹ ایک فنی تجزیہ۔امتیاز بشیر۔یونی ورسٹی آف اورینٹل کالج پنجاب یونی ورسٹی،لاہور ۱۹۷۹ء

انعامات واعزازات:

ادبی انعامات مصنف کی برتری ہی کو قبول نہیں کرتے بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کا بھی سبب بنتے ہیں۔انتظار حسین کو بھی وقفے وقفے پر متعدد ادبی انعامات سے نوازا گیا۔ان کی ادبی خدمات کو بین الاقوامی سطح پر نہ صرف تسلیم کیا گیا بلکہ انھیں کئی بین الاقوامی انعامات سے بھی نوازا گیا۔ ہندستان ،جرمنی ،فرانس اورانگلستان(

لندن) جیسے ملکوں کے اعلی انعامات بھی ان کی جھولی میں آئے۔

انتظار حسین کو اولین ادبی انعام ان کے افسانہ 'بیریم کاربونیٹ' پر مجلس ترقی ادب کی جانب سے ۱۹۵۸ء ملا۔ان کے مقبولِ عام ناول 'بستی' لے لیے حکومت پاکستان نے 'آدم جی ادبی انعام' دینے کا اعلان کیا تھا۔مگر موصوف نے پاکستان رائٹر گلڈ کے سیکریٹری کو ایک خط کے ذریعے ایوارڈ لینے سے انکار کر دیا۔ ۱۹۹۳ء میں ہندستان کے ناشر روپا کمپنی نے ہار پر اینڈ کالنز کے تعاون سے یاترا انعام کا اعلان کیا۔اس کا پہلا انعام ۱۹۹۴ء میں انتظار حسین کو ملا۔حکومتِ پاکستان کی طرف سے ''ستارہ امتیاز'' اور اکادمی ادبیات پاکستان کی جانب سے پاکستان کے سب سے بڑے ادبی اعزاز ''کمالِ فن ایوارڈ'' سے بھی انتظار حسین کو سرفراز کیا گیا۔ان کے علاوہ موصوف کو 'پرائڈ آف پرفامنس' ، 'اے آروائی گولڈ ایوارڈ' اور 'انجمن فروغ ادب دوحہ' جیسے انعامات بھی ملے ہیں۔

انتظار حسین کو ملنے والے تین ادبی انعامات کا خصوصی ذکر کرنا لازمی ہے۔ان میں اولین ادبی انعام 'مین بکر پرائز' کے لیے نامزدگی ہے۔اگر چہ یہ انعام ان کے حصے میں نہیں آیا مگر پھر بھی اردو کی ادبی تاریخ میں ایسا پہلی بار ہوا کہ کوئی ادیب اس ایوارڈ کے لیے شاٹ لسٹ کیے گئے۔ مین بکر فاؤنڈشن کی جانب سے ہر دو سال کے بعد تقریباً ساٹھ ہزار پاؤنڈ کا یہ ادبی انعام کسی ایسے زندہ ادیب کو دیا جاتا ہے جو انگریزی زبان میں لکھتا ہو یا اس کے کتابیں عام طور پر انگریزی میں دستیاب ہوں ۔۲۰۱۳ء میں جن دس ناول نگاروں کو اس عظیم ایوارڈ کے لیے شارٹ لسٹ کیا گیا ان میں انتظار حسین بھی شامل تھے۔اس فہرست میں انتظار حسین کی شمولیت کے سلسلے میں مسعود اشعر کے روزنامہ 'جنگ' کا ایک اقتباس ڈاکٹر عبدالباسط اپنی کتاب میں یوں نقل کرتے ہے کہ:

> '' بکر انٹرنیشنل انعام کے لیے دنیا بھر کے جن ڈیڑھ سو سے زیادہ ناول نگاروں میں دس ناول نگاروں کو آخری انتخاب کے لیے چنا گیا ان میں ان (انتظار حسین) کا نام بھی شامل ہے۔۔۔۔مبارک باد صرف انتظار حسین کے لیے ہی نہیں بلکہ اردو زبان کے لیے ۔۔۔۔

بالآخر اسے بھی بین الاقوامی طور پر تسلیم کر لیا گیا۔یعنی اردو ادب کو بھی
عالمی درجہ۔۔۔۔انتظار حسین کے تخلیقی کارناموں کی وجہ سے۔۔۔دنیا بھر
میں جہاں جہاں بھی اردو زبان ۔۔۔۔ان کی طرف سے انتظار حسین
شکریہ کے مستحق بھی ہیں۔'' ۲۴

انتظار حسین اس انعام کے لیے لندن بلائے گئے۔آصف فرخی کے ہمراہ لندن کا سفر کیا۔اس یادگار سفر کی پوری تفصیل انھوں نے اپنی خودنوشت 'جستجو کیا ہے' میں رقم کی ہے۔ڈاکٹر عبدالباسط اس انعام کے فاتح کا ذکرِ خیر یوں کرتے ہے کہ:

''اس انعام کے حق دار کا اعلان لندن کے وکٹوریہ اورالبرٹ
میوزم کی ایک تقریب میں ہوا۔ اس انعام کی حق دار امریکا کی
'لیڈیا ڈیوس' ٹھہریں ۔'' ۲۵

دوسرا ادبی انعام جس کا ذکر کرنا ضروری ہے وہ انتظار حسین کو حکومتِ فرانس کی جانب سے دیا جانے والا "Offcier des Order des Arts et Letters" ہے۔ یہ ادبی انعام انتظار حسین کو ۲۰۱۴ء میں ملا تھا۔۲۰ دسمبر ۲۰۱۴ء کو لاہور میں ایک تقریب منعقد کی گئی جس میں فرانس کے سفیر نے انتظار حسین کو اس اعزاز سے نوازا۔تیسرا ادبی اعزاز ہندستان کے ساہتیہ اکیڈمی کی جانب سے ملنے والا ''پریم چندفیلوشپ'' ایوارڈ ہے ۔

(ج) تخلیقی انفرادیت

تقسیم ہند کے بعد تخلیق کئے گئے اردو فکشن میں انتظار حسین اپنے افسانوں اور ناولوں کے منفرد اسلوب اور علاماتی اندازِ بیان کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں۔ موصوف کا طویل تخلیقی سفر ہے۔ ان کی ادبی عظمت کا اعتراف برِصغیر ہندو پاک کے ادبی حلقوں میں کیا گیا ہے۔ پروفیسر شمیم حنفی ایک مقام پر ان کا تعارف پیش کرتے ہوئے یوں فرماتے ہیں کہ:

''ہمارے زمانے کی ادبی معاشرت پر جن لوگوں کا سایہ بہت
گہرا اور بہت طویل ہے، ان میں انتظار حسین صاحب بھی ہیں''۔ ۲۶

انتظار حسین جدید اردو کے جمہور اور معتبر فکشن نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ انھوں نے جدید دور میں اردو فکشن کو اپنے ہم عصر فکشن نگاروں کے برعکس نئے فنی وفکری انداز اور رنگ عطا کئے۔ موصوف نے جس زمانے میں اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا وہ شکست و ریخت کا دور تھا۔ ایک طرف تقسیم ہند کا المیہ زوروں پر تھا تو دوسری طرف ترقی پسند تحریک کا شہرازہ بکھر رہا تھا۔ لیکن انتظار حسین نے نہ صرف ترقی پسند تحریک کے سکہ بند اصولوں کی زنجیر کو توڑا بلکہ ایک نئے رجحان یعنی جدیدیت کا بھی خود کو حد درجہ مقید نہیں کیا۔ اپنی تخلیقات کو اپنے ہی منفرد انداز میں لکھتے رہے۔ کسی تحریک یا پارٹی سے وابستگی کو وہ معیوب سمجھتے تھے۔

اس بات کا برملا اظہار انھوں نے اپنے ایک انٹرویو کے دوران مقصود دانش سے کیا جو ''انتظار حسین سے گفتگو'' کے عنوان سے ماہانہ انشاء کلکتہ کے نومبر ۲۰۰۸ء کے شمارے میں شامل ہے۔ اس ماہانہ میں شامل انٹرویو کے چند سوالات وجوابات یوں ہیں:

سوال: مقصود دانش: ترقی پسندوں نے بھی آپ کو اپنی طرف کھینچا۔ جدیدیوں نے بھی اور اب مابعد جدیدیت والے بھی آپ کو اپنا کہہ رہے ہیں ؟

جواب: انتظار حسین: دیکھئے بھائی! میں تو پہلے ہی کہہ چکا ہوں کی فن کار کو ان سب جھمیلوں میں نہیں

پڑنا چاہیئے ۔اگر میری تخلیقات ِ مذکورہ ادبی رویوں کو مواد فراہم کر رہی ہیں تو یہ میرے لئے مسرت کی بات ہے ۔ لیکن یہ خانہ بندی میرے ذہن میں نہیں ہے ۔

سوال: مقصود دانش: جس زمانے میں جیمس جوائس اور ورجینا ولف ہمارے یاں خوب چبائے اور اُگلے جارہے تھے ۔اس وقت آپ کافکااور چیخوں سے محظوظ ہو رہے تھے ؟

جواب انتظار حسین: پیڑ مٹی ہر قسم کی فصل نہیں اُگا سکتی ۔ برصغیر کا جو کلچر ہے ،تخلیقی طور پر مغرب کی تمام چیزوں کو آمیز نہیں کرسکتا ۔یہی وجہ ہے کہ اس عہد میں بہت ساری تخلیقات تجدیدی عمل سے فیض یاب ہو کر قاری سے کٹ گئیں ۔کافکا اور چیخوں کا مطالعہ مذکورہ پس منظر میں آپ نہیں کر سکتے ۔ام کے اثرات یقیناً اردو فکشن پر پڑے ۔

سوال مقصود دانش : آپ کی بیشتر تخلیقات میں یا تو بوڑھی خواتین نمودار ہوتی ہیں ،کردار کے طور پر ،یا تو بیوہ صفت جوان عورتیں ،سوگندھی جیسی عورتیں آپ کے ہاں نظر نہیں آتیں ؟

جواب انتظار حسین : آپ نے بالکل سچ کہا ،میرے ہاں سوگندھی جیسی عورتیں آبھی نہیں سکتیں ۔ میں ایک ایسے معاشرے کو تمثیلی صورت میں پیش کرنے کی کوشش کرتا ہوں ،جو بوڑھی خواتین سے ہی مماثل ہے ۔ میرے ہاں جوان بیوہ صفت عورتیں اس لئے آپ کو نظر آتی ہیں کہ میں جس زمین کی کہانی لکھتا ہوں اس کا حسن زائل ہو چکا ہے ۔اس کے گہنے کسی نے چھین لئے ہیں ،یہ زمین مجھے بیوہ کے روپ میں نظر آتی ہے ۔یہی وجہ ہے کہ سوگندھی ہمارے ہاں نہیں آسکتی ۔ ۲۷

انتظار حسین نے اپنی تخلیقی راہ کو خود کرید کر بنایا ہے ۔وہ دوسروں کے بندھے ٹکے اصولوں کے پابند کبھی نہیں رہے ۔انھوں نے جو ادب تخلیق کیا وہ ماضی اور حال کا بہترین امتزاج ہے ۔ان کی تخلیقات کو پڑھنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ ایلیٹ نے اچھے ادیب کی جو تعریف کی ہے ۔انتظار حسین کی تخلیقات اس کا ایک عکس پیش کرتی ہے ۔ پروفیسر شمیم حنفی ایلیٹ کا یہ قول نقل کرتے ہوئے انتظار حسین کے مقام کا تعین کرتے ہیں کہ:

''اچھا ادیب جو ہوتا ہے ۔ وہ اپنے حال ہی پر اثر انداز نہیں

ہوتا۔اپنے ماضی پر بھی اثر انداز ہوتا ہے'' ۲۸؎

ان کی تخلیقات کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد صاف ظاہر ہوتا ہے کہ عظیم ادب سرحدوں اور نظریوں کا مقید نہیں ہوتا ہے۔انتظار حسین روش عام سے ہٹ کر لکھنے والے ادیب ہے۔ان کے بحث وافکار کو سمجھنا عام قاری کے لئے دشوار ہے۔ان کے فنکارانہ اسلوب اور ماضی و حال کے امتزاج کی وجہ سے ان کی تخلیقات ذہین اور باذوق قاری کو تلقین کرتی ہیں۔علاماتی و استعارتی، داستانوی، اساطیری، دیو مالائی اسلوب سے اردو فکشن کو مغرب کے جدید فکشن کے مقابل میں کھڑا کر دیا۔ان کے اس لاثانی اسلوب کے بارے میں مابعد جدید تھیوری کے نامور ادیب گوپی چند نارنگ یوں رقم طراز ہیں:

''انتظار حسین اس عہد کے اہم ترین افسانہ نگاروں میں سے
ہیں۔اپنے پر تاثیر تمثیلی اسلوب کے ذریعے انھوں نے اردو افسانے کو
نئے فنی۔۔۔۔۔رشتہ بیک وقت داستان، حکایت، قدیم اساطیر اور دیو
مالا سے ملا دیا۔۔۔۔۔داستانی انداز ہمارے اجتماعی لاشعور اور مزاج
کا کئی زیادہ ساتھ دیتا ہے۔'' ۲۹؎

انتظار حسین کا مطالعہ بہت وسیع تھا انھیں روایت پر خاصی دسترس حاصل تھی۔قرآن شریف، احادیث مبارکہ، صوفیائے کرام کے ملفوظات، جاتک کتھا، رامائن، بدمت، وغیرہ پر انھیں گہری نظر تھی اور ساتھ ہی ساتھ انھیں مغربی مفکرین کا مطالعہ بھی تھا۔خاص طور پر چیخوف اور کافکا کا اثر ان کے یہاں جھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔انھوں نے کافکا کی ایک مشہور تحریر "Metamorphsis" جیسا اردو میں ''کایا کلپ'' کے نام سے اردو میں لکھا اس حوالے سے ڈاکٹر فوزیہ اسلم یوں لکھتی ہیں:

''انتظار حسین اس بات سے اتفاق نہیں کرتے کہ ان کے فن
پر کافکا کا اسلوب نمایاں ہے۔لیکن ان کے۔۔۔۔۔ خاص طور پر'
کایا کلپ' کی تفہیم کافکا کے زیر اثر ہی ہوسکتی ہیں۔'' ۳۰؎

انتظار حسین چونکہ ذہنی طور پر ادیبوں کی خانہ بندی کے قائل نہیں تھے ،مگر ان کی تخلیقات میں جدیدیت کو نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔جیسا کہ جدیدیت سے وابستگی رکھنے والے فکشن نگاروں نے اپنے یہاں رشتوں کی شکشت و ریخت ،ڈر،خوف، ذہنی انتشار،جلا وطنی، سفرِ داخلی وذہنی کیفیات ،کرب، تنہائی،احساسِ محرومی ومایوسی،احتجاج،ماضی کی بازیافت اور کھوئے ہوئے رشتوں کی تلاش جیسے دل سوز و دل خراش موضوعات کو تخلیقات کی زینت بنایا ہے۔یہ سب موضوعات انتظار حسین کے یہاں پائے جاتے ہیں۔اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ ان کی لاشعوری طور پر جدیدیت سے گہری وابستگی تھی۔

انتظار حسین کی تحریروں کو پڑھ کر مسرت کا ایک دیلا سا آتا ہے جس کی بنا پر ان کے سنجیدہ قارئین کے پاؤں اکھڑ جاتے ہیں۔ان کی خود ساختہ صورت حال حقیقت سے بہت دور ہے۔اس طرح کی صورت حال تخیل کے حوالے سے یورپ میں سامنے آئی۔موصوف کے یہاں یادِ ماضی کلاسکیت سے محبت ماضی پرستی ،ماضی پر نوحہ خوانی اور روایت میں پناہ کی تلاش نظر آتی ہے۔یہ اپنے اقدار کے بکھرنے اور نئی اقتدار کے سطحی اور جذباتی ہونے کا دکھ اور اظہار کے ضمن میں بہت سی جگہوں پر انداز اور لب ولہجہ ترش ہو جاتا ہے۔ان کے افسانوں اور ناولوں کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انھیں زندگی کی ظاہری بناوٹ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔البتہ باطن میں جو حالت درپیش ہوئی اس کا خیال رکھتے تھے۔یہی باطن کی غوطہ زنی اور اسلوبیات تنوع انتظار حسین کی پہچان ہے۔

انتظار حسین کے مطابق اردو فکشن کی روایت میں تین دھاریں ملتی ہیں۔پہلی عرب وعجم کی روایت جس کا سب سے بڑا نمونہ الف لیلہ ہے۔دوسری مغرب کی روایت اور تیسری قدیم ہندستان کی روایت۔انتظار حسین ان تینوں دھاروں کو بروئے کار لاکر کہانی لکھتے ہیں۔ان کی کہانیوں میں یہ امتزاج ہی ان کی تخلیقی انفرادیت کا ضامن ہے۔

حوالہ جات

۱۔ انتظار حسین ایک دبستان ، مرتب ارتضیٰ کریم ، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس ،دہلی ۱۹۹۶ء (ص ۔ ۴۷)

۲۔ تاریخ ادب اردو جلد سوم، وہاب اشرفی ، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی ۲۰۰۷ء (ص ۔ ۱۲۱۳)

۳۔ انتظار حسین کا تنقید کا شعور، ڈاکٹر عبدالباسط، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس،دہلی ۲۰۱۹ء (ص ۔ ۱۱)

۴۔ ایضاً (ص۔ ۱۱)

۵۔ جستجو کیا ہے، انتظار حسین ، سنگ میل پبلی کیشنز ، لاہور ۲۰۱۱ء (ص ۔ ۲۱)

۶۔ https;//youtu.be/iwUpOb9iR3A [Interview. BBC News Urdu] ۲۸ مئی ۲۰۰۸ء

۷۔ انتظار حسین ایک دبستان ، مرتب ارتضیٰ کریم ، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس،دہلی ۱۹۹۶ء (ص ۔ ۹۹)

۸۔ جستجو کیا ہے ، انتظار حسین ، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۲۰۱۱ء (ص ۔ ۵۸)

۹۔ ایضاً (ص ۔ ۳۳)

۱۰۔ انتظار حسین ایک دبستان ، مرتب ارتضیٰ کریم ں ، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی ۱۹۹۶ء (ص ۔ ۵۰)

۱۱۔ جستجو کیا ہے، انتظار حسین، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۱۱ء (ص ۔ ۲۵

۱۲۔ جستجو کیا ہے ، انتظار حسین ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۱۱ء (ص ۔ ۲۱)

۱۳۔ جستجو کیا ہے ، انتظار حسین ، سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور ۲۰۱۱ء (ص ۔ ۲۲)

۱۴۔ جستجو کیا ہے ، انتظار حسین ، سنگ میل پبلی کیشنز ، لاہور ۲۰۱۱ء (ص ۔ ۵۹)

۱۵۔ انتظار حسین ایک دبستان ، مرتب ارتضیٰ کریم، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس،دہلی ۱۹۹۶ء (ص ۔ ۱۷)

۱۶۔ جستجو کیا ہے ، انتظار حسین ، سنگ میل پبلی کیشنز ،لاہور ۲۰۱۱ء (ص ۔ ۸۸)

۱۷۔ ایضاً (ص ۔ ۸۹)

۱۸۔ ایضاً (ص ۔ ۹۰)

۱۹۔ ایضاً (ص ۔ ۷۳)

۲۰۔ ایضاً (ص ۔ ۱۳۵)

۲۱۔ انتظار حسین ایک دبستان ، مرتب ارتضی کریم ، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی ۱۹۹۶ء (ص ۔ ۴۸)

۲۲۔ جستجو کیا ہے ، انتظار حسین ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۱۱ء (ص ۔ ۸۱)

۲۳۔ جستجو کیا ہے ، انتظار حسین ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۱۱ء (ص ۔ ۸۷)

۲۴۔ انتظار حسین کا تنقید کا شعور ، ڈاکٹر عبدالباسط ، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی ۲۰۱۹ء (ص ۔ ۳۳)

۲۵۔ ایضاً (ص ۔ ۳۳)

۲۶۔ ANJUMAN TARAQQI URDU HIND [https;//youtu. be/yhPXjd-704k] دسمبر ۲۰۱۸ء

۲۷۔ ماہنامہ انشاء، انشاء پبلی کیشنز، کلکتہ، شمارہ: ۱۲۔۱۱، مدیر: ف۔س۔اعجاز ، نومبر۔دسمبر ۲۰۰۸ء (ص ۔۷،۶)

۲۸۔ Jashn e Adab [https;//youtu.be/q5VPnzyCr4k] فروری ۲۰۱۶ء

۲۹۔ انتظار حسین اور ان کے افسانے، مرتب گوپی چند نارنگ، ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ ۱۹۸۶ء، (ص۔۵)

۳۰۔ اردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجربات، ڈاکٹر فوزیہ اسلم ، پورب اکادمی ، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء (ص۔ ۴۰۴)

باب دوم

انتظار حسین کے معاصر ناول نگار۔ ایک عمومی جائزہ

(ا) شوکت صدیقی، عبداللہ حسین

(ب) قرۃ العین حیدر، خدیجہ مستور

(ج) رامانند ساگر، رام لعل، جوگندر پال

(د) قدرت اللہ شہاب اسلم فرخی

(الف) شوکت صدیقی

شوکت صدیقی ۱۹۲۳ء سے ۲۰۰۶ء تک:

شوکت صدیقی کا اصل نام شوکت حسین صدیقی ہے۔لیکن ادبی دُنیا میں شوکت صدیقی کے نام سے مشہور ہوئے۔موصوف ۲۰/مارچ ۱۹۲۳ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ یہ انتظار حسین کے ہم عصر ناول نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی طرح ہی تقسیم ہند کے بعد ۱۹۵۰ء میں ہندوستان سے پاکستان ہجرت کرتے ہیں۔

جہاں تک ان کے تعلیمی سفر کی بات ہے انھوں نے درجہ سوم سے ہفتم تک جبلی ہائی اسکول لکھنؤ اور جماعت ہشتم کی تعلیم نواب گنج ہائی اسکول کانپور سے حاصل کی۔۱۹۳۸ء میں اسلامیہ ہائی اسکول لکھنؤ سے میٹرک پاس کیا۔ ایف اے، بی اے اور ایم اے (سیاست) پرائیویٹ سے پاس کیا۔۱۹۵۲ء میں ثریا بیگم نامی خاتون سے کراچی (پاکستان) میں شادی کی۔

شوکت صدیقی نے ابتداء میں صحافتی زندگی اپنائی اور ۱۹۴۴ء میں ماہنامہ ''ترکش''، لکھنؤ کے شریک مدیر ہوئے۔ پھر مختلف روز ناموں اور ماہناموں سے منسلک رہے۔ جیسے ''جدید ادب''، ''فیض آباد''، ''الفتح'' اور روزنامہ ''فسادات''، کراچی وغیرہ

۱۹۸۴ء میں صحافت سے کنارہ کشی کے بعد تخلیقی ادب پر توجہ مرکوز کی شوکت صدیقی کی تصانیف میں۔

۱۔تیسرا آدمی ۱۹۵۱ء ۲۔''اندھیرا اور اندھیرا'' ۱۹۵۵ء

۳۔راتوں کا شہر ۱۹۵۶ء ۴۔کیمیا گر ۱۹۸۴ء

افسانوی مجموعے شامل ہیں۔اس کے علاوہ موصوف کے چار ناول بھی ہیں جس کی زمانی ترتیب کچھ یوں ہے۔

۱۔کمین گاہ ۱۹۵۶ء ۲۔خدا کی بستی ۱۹۵۸ء

۳۔ جانگلوس ۱۹۸۸ء (ایک ضخیم ناول ہے جس کی تین جلدیں ہیں)

۴۔ چار دیواری ۱۹۹۰ء میں ترتیب سے منظر عام پر آئے ۔ شوکت صدیقی ۸۵ برس کی عمر میں ۱۶/ دسمبر ۲۰۰۶ء کو کراچی (پاکستان) میں فوت ہوگئے ۔

شوکت صدیقی نے ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس میں پاکستانی وفد کے سربراہ کی حیثیت سے غیر ممالک کا بھی دورہ کیا۔ پاکستان وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کے ہمراہ بھی غیرملکی دورہ کرنے کا شرف حاصل ہوا ہے ۔شوکت صدیقی بیسویں صدی کے اردو ناول کے فکری وفنی ارتقا کے سلسلے کا ایک اہم نام ہے۔ ان کی بیش تر تخلیقات کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ زیور اشاعت سے محروم رہی ہے ۔ وہاب اشرفی ''تاریخ ادب اردو'' میں اس کے بارے میں یوں لکھتے ہے کہ

> '' شوکت صدیقی اردو ناول کے فکری اورفنی ارتقا کے سلسلے کا
> ایک اہم نام ہے۔ انھوں نے کہانیاں بھی لکھیں اورناول بھی............
> لیکن جو بھی فہرست ہوگی وہ نامکمل ہوگی اس لئے کہ ان کی بہت سی
> تخلیقات مرتب ہوکر شائع نہیں ہوئی ہیں۔''(۱)

اُردو ناولوں میں شوکت صدیقی کے ناول ''خدا کی بستی'' کو بے حد شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی ۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ موجودہ دور کے ناولوں میں اسے ایک امتیازی درجہ حاصل ہے کیونکہ پریم چند ہی کی طرح شوکت صدیقی نے زندگی اوراس کی تمام تلخیوں کو وسیع تجربات ومشاہدات کے آئینے میں دیکھا اوراپنے دور کی سماجی کشمکشوں ، معاشی الجھنوں احلاقی گمراہیوں اور پیچیدہ معاشرتی حقیقتوں کو تفصیل کے ساتھ ناول کے پلاٹ میں سمونے کی کاوش کی ہے ۔تقسیم کے بعد کی زندگی اور نوتشکیل پذیر پاکستانی معاشرے کے مسئلوں کو انہوں نے خوبصورتی اور بے باکی سے پیش کیا ہے ، انہوں نے بے راہ روی کو چھپانے کی بجائے بے نقاب کیا ہے ۔ بے اعتدالیوں کی وضاحت کی ہے، سماجی گمراہیوں اوراستحصالی رویوں کی پشت پناہی نہیں کی ضرب لگائی ہے، ایک حسین خواب کی خوفناک تعبیر سے پیدا ہونے والے ماحول کی نہایت پرُ اثر کامیاب عکاسی کی ہے ۔ وہ مضمحل روایتوں کی

تنقید کو نامناسب سمجھتے ہیں مگر صالح انسانی معاشرے کی تشکیل کے لئے بہتر انسانی قدروں کی جستجو کو اہمیت دیتے ، بقول ڈاکٹر قمر رئیس:

''پاکستان کے سرمایہ پرستانہ طبقاتی معاشرے میں مذہب کے نام پر جن بہیمانہ جرائم کی سرپرستی ہوتی ہے اور جمہوریت کے نام پر انسان کی آواز اور اس کے حقوق کو جس طرح پامال ، شوکت صدیقی کا فن تصور پرستی اور رومانیت کے ان عناصر سے پاک ہے۔ انہوں نے سماجی حقیقت نگاری کی اس اعلیٰ روایت کو نئی وسعت دی ہے، جس کی تعمیر پریم چند نے کی تھی۔ ان کا طبقاتی شعور اور انسان دوستی کا تصور ناول میں پریم چند سے آگے کی راہ دکھاتا ہے۔''(۲)

دراصل یہ ناول پاکستان کے ایک ایسے دور کی تصویر پیش کرتا ہے جس میں سرمایہ دارانہ نظام کی کشمکش بھی ہے اور معاشرتی ، تہذیبی اور اقتصادی قدروں کا بحران بھی ۔ اس ناول میں زندگی کے وہ مسئلے کھل کر سامنے آئے ہیں۔ جن سے ہماری معاشرتی زندگی عبارت ہے۔ ناول کی ابتداء میں گمراہ لڑکوں اور ان کی آوارہ مزاجی کا تذکرہ ہے ، ایک طرف یہ لڑکے معاشرتی پستی میں مبتلا ہیں تو دوسری طرف شہر کے جرائم پیشہ عناصر کے شکار ۔ زندگی گذارنے کی مجبوریاں ان کے کردار کی تباہیوں کا سبب ہیں ، یہ مارے مارے پھرتے ہیں اور پھر جرائم کے ایسے ماحول میں پھنس جاتے ہیں جس سے نجات کی کوئی راہ نظر نہیں آتی اور عاجز آ کر بے کیفیوں اور بیزاریوں کا اظہار کرتے ہیں:

''یار میرا جی چاہتا ہے کہ مرجاؤں'' سالی اس زندگی میں رکھا ہی کیا ہے۔''(3)

ان لڑکوں میں سے ایک لڑکا راجہ کوڑھی ہوجاتا ہے اور بھیک مانگنا شروع کردیتا ہے، ایک دوسرا لڑکا نوشہ جذبۂ انتقام سے مغلوب ہوکر اپنی ماں کے بدلے کے طور پر نیاز کو قتل کر ڈالتا ہے اور عمر قید کی سزا پاتا ہے۔ شوکت

صدیقی نے دراصل شہری زندگی کے المناک رخ سے پردہ اٹھایا ہے۔ یہ بچے تعلیم وتربیت سے محروم ہیں اور والدین کی غفلتوں کی سزا انہیں ملتی ہے، گھر کی محفوظ و مامون زندگی سے نکل کر جرائم کے اڈوں تک پہنچتے ہیں اور ان کی پوری زندگی آلام وآزمائش میں محصور ہو جاتی ہے۔

ناول خدا کی بستی کے خالق شوکت صدیقی پر وہاب اشرفی یوں رقم طراز ہیں کہ

''میرا مطالعہ بتاتا ہے کہ شوکت صدیقی چارلس ڈیکن سے بے حد متاثر ہیں ''خدا کی بستی'' میں اس کے ناول ''ایورٹوئسٹ'' کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔ حالانکہ یہاں کلی طور پر ٹوپوگرافی پاکستانی ہے لیکن ایسے اثرات کے باوجود ناول کے امتیاز اور انفرادیت پر کوئی آنچ نہیں آتی۔''(4)

شوکت صدیقی کے کردار دھیرے دھیرے ارتقا پذیر ہوتے ہیں اور اپنی اپنی ڈسٹنی کے مطابق ڈھلتے ہوئے اپنا رول انجام دیتے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ ''خدا کی بستی'' میں افکار کی گہرائی نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس ناول کا موضوع عوامی زندگی اور عمومی مسائل سے وابستہ ہے۔ موضوع کے تقاضے کی تکمیل کے لئے ناول نگار کو فطری طور پر ایسا اسلوب اختیار کرنا پڑا ہے جو اس کے مقصد کی آسانی سے ترجمانی کر سکے، شہر کی دفتری زندگی، دفتری ماحول اور دفتری تعلقات کے نشیب وفراز کو جس وضاحت اور خوش اسلوبی کے ساتھ اس ناول میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کی دوسری مثال شاید ہی کہیں ملے۔ سلمان اور رخشندہ کے ازدواجی تعلقات میں سلمان کے دفتری باس جعفری کے حائل ہو جانے کا واقعہ موجودہ معاشرے کے دفتری نظام کے کھوکھلے پن کو ظاہر کرتا ہے۔ افسروں کی نگاہ میں سرخسرو ہونے اور ترقی حاصل کرنے کے لئے غیر اخلاقی ہتھکنڈوں کو استعمال کرنا اور عزت وآبرو کا سودا کرنا ہمارے معاشرے کی ایک شرمناک حقیقت ہے۔ شوکت صدیقی نے بڑی جرأت کے ساتھ اسے بے نقاب کیا ہے۔

شوکت صدیقی نے عام انسانی زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور معاشرے میں پرورش پانے والے

مسئلوں اور الجھنوں کا دیانت داری سے جائزہ لیا ہے، اس ناول میں فٹ پاتھ پر پیدا ہونے والے جرائم سے لے کر اعلی سیاسی حلقوں اور سرکاری دفاتر میں رینگتی ہوئی گمراہیوں تک کی عکاسی کی گئی ہے، اسکائی لارکوں کی تحریک و تنظیم کے ذریعے شوکت صدیقی نے ایسی تمام بے راہر دیوں کے خلاف نبرد آزما قوتوں کی نشاندہی کی ہے، اس کی وجہ سے ناول میں ایک طرح کی مثالیت پسندی پیدا ہوگئی ہے۔ اسکائی لارکوں کی عملی سرگرمیاں اور 'فلک پیما' کے اصلاحی اور رفاہی منصوبے ایک حد تک غیر حقیقت پسندانہ بن گئے ہیں۔ اقتدار پرستوں، خودغرضوں، استحصال پسندوں اور سرمایہ داروں کے خلاف سرگرمیوں کے نتیجے میں اسکائی لارکوں کو طرح طرح کی آزمائشوں سے گذرنا پڑتا ہے، مگر ان کی ثابت قدمی غیر معمولی عزم واستقلال کی ترجمانی کرتی ہے۔ اس طرح کی تنظیموں کا وجود میں آنا کوئی آسان بات نہیں، عملی دنیا میں اس طرح کی تنظیمیں خیالی اور تصوراتی حیثیت رکھتی ہیں۔ شوکت صدیقی نے دراصل معاشرتی ڈھانچے میں تبدیلیوں کے امکانات کا جو خواب دیکھا ہے، اسکائی لارکوں کی تنظیمیں سرگرمیوں کی شکل میں منظر عام پر آیا ہے۔ بہ حیثیت مجموعی اس ناول میں شوکت صدیقی اپنے عہد کی مکمل تصویر پیش کرنے میں بہت کامیاب رہے ہیں۔ اردو میں ناول نگاری میں ''خدا کی بستی'' ایک اضافہ ہے۔

اس ناول کے بارے میں وہاب اشرفی یوں لکھتے ہیں کہ

> ''دراصل ناول نگار نے پاکستان کے مجرمانہ ماحول پر ایک فنی نگاہ ڈالی ہے۔ بچے خصوصاً پسماندہ کی طرح برباد ہوتے ہیں، کس طرح ان کا استحصال کیا جاتا ہے اور کس طرح انہیں جرائم کی دُنیا میں دھکیل دیا جاتا ہے یہ ناول کا قوام ہے۔''(5)

اس ناول میں مصنف نے استحصال زدہ معاشرے میں چھپے شریر کرداروں کی منافقانہ روش کو بے نقاب کیا ہے۔ جو جنسی کجروی کے شکار نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر مسیحائی کرنے کے بجائے موت کے گھاٹ اتارنے کے درپے ہے۔ عرض کہ پورا سماج ایک ایسا حمام ہے جس میں اکثریت برہنہ لوگوں کی ہیں، جن کا اصول پسندی اور زندگی کی اعلیٰ قدروں سے دور دور تک کوئی سروکار نہیں۔ گویا خدا کی بستی میں شیطان بستے ہیں اور اپنی شیطانیت سے دُنیا کو

خرابہ بنائے ہوئے ہیں۔ یہ ہے وہ منظر نامہ جس میں یہ ناول وجود میں آیا۔شوکت صدیقی کے اس شاہکار ناول کو اس کے مختلف کرداروں جیسے راجہ، رخشندہ، سلطانہ، سلمان، شامی، شاہ جی، نیاز، نوشہ، عبداللہ متری وغیرہ کے افعال نے ایک زندہ ناول بنا دیا ہے۔

الغرض شوکت صدیقی کو بیسویں صدی کے فکشن میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ وہ ہجرت کر کے پاکستان گئے اور پاکستان کو''خدا کی بستی'' سے تعبیر کرتے ہوئے اس میں بسنے والوں پر ایک سوالیہ نشان اٹھایا ہے کہ کیا واقعی وہ ملک جو صرف اور صرف ایمان داری اور حق پرستی کی بنیاد پر ملا تھا۔ کیا اس ملک کے مکین ان سب خوبیوں اور انسان دوستی خصائل سے متعف ہیں کہ نہیں۔ اس سوال کا جواب اس ملک میں بسنے والے باشندوں کو بطورِ کردار پیش کر کے ان کی عملی زندگی سے دیا ہے، جو حد درجہ دل گرفتہ، دل خراش اور دل دوز معلوم ہوتا ہے۔

عبداللہ حسین ۱۹۳۱ء سے ۲۰۱۵ء تک

عبداللہ حسین کا اصل نام محمد خان تھا اور قلمی نام عبداللہ حسین ۱۴/اگست ۱۹۳۱ء کو غیر منقسم ہندوستان کے شہر راوَل پنڈی میں ان کی ولادت ہوئی۔ ان کے والد کا نام محمد اکبر خان تھا۔ ابتدائی تعلیم مولوی صدرالدین سے حاصل کی، پھر گجرات کے اسلامیہ ہائی اسکول سے میٹرک ۱۹۴۶ء میں اور زمیندار کالج سے بی ایس سی ۱۹۲۵ء میں کیا۔عبداللہ حسین انتظار حسین کی پیدائش سے چھ سال بعد پیدا ہوئے۔ بیسویں صدی کے فکشن کا جب بھی ذکر آتا ہے تو عبداللہ حسین کا ذکر کرنا لازم ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے عہد کے مقبول ترین فکشن نگاروں میں شامل ہوتے ہیں۔ انھوں نے اپنے ہم عصر فکشن نگار انتظار حسین کے ساتھ ساتھ ہی اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ان کے ادبی سفر کا باقاعدہ آغاز ۱۹۵۶ء میں ہوا جب انھوں نے ناول''اداس نسلیں'' لکھ کر ادبی حلقوں میں اس کی اشاعت (۱۹۶۱ء) پر اپنی تخلیقی صلاحیت کو منوایا۔موصوف کے چار افسانوی مجموعے اور تین ناول ان کے ادبی کارناموں میں شامل ہیں۔

ان کا اوّلین افسانوی مجموعہ''نشیب'' کے نام سے ۱۹۸۱ء میں شائع ہو۔ دوسرا افسانوی مجموعہ''سات

رنگ'' کے نام سے ۱۹۸۵ء میں منظر عام پر آیا۔ تیسرا مجموعہ ''رات'' ۱۹۹۷ء میں زیورِ اشاعت سے آرستہ ہوا۔ چوتھا اور آخری مجموعہ ''فریب'' ۲۰۱۲ء میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ پہلا ناول ''اُداس نسلیں'' ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا، دوسرا ناول ''باگھ'' کے نام سے ۱۹۸۲ء میں منظر عام پر آیا۔ تیسرا اور آخری ناول ''نادار لوگ'' ۱۹۹۶ء میں شائع ہوا۔ ایک ناولٹ ''قید'' کے نام سے لکھا جو ۱۹۸۹ء میں زیورِ اشاعت سے آراستہ ہوا۔ عبداللہ حسین کا انتقال ۴ر جولائی ۲۰۱۵ء کو ۸۴ برس کی عمر میں لاہور میں ہوا۔ عبداللہ حسین کا سب سے اہم کارنامہ ان کا شاہکار ناول

''اُداس نسلیں'' ہے جس پر انھیں ۱۹۶۳ء میں آدم جی ادبی
انعام سے نوازا گیا۔''

''اُداس نسلیں'' اردو کے چند نمایاں ناولوں میں ایک ہے۔ عبداللہ حسین نے اس ناول میں پہلی جنگ عظیم سے لے کر تقسیم ہند تک کے واقعات اور انگریزوں کی سیاسی سازشوں کو پس منظر کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اس ناول کے پلاٹ کی وسعت برصغیر کے پیچیدہ تر معاشی حالات کی ترجمانی کرتی ہے، اور غیر منقسم ہندوستان کے ایک بڑے ماحول کو پیش کرتی ہے۔ بقول ڈاکٹر قمر رئیس:

''اداس نسلیں'' پہلا ناول ہے جس میں پہلی جنگ عظیم سے
لے کر تقسیم ہند تک برطانوی سامراج کی سیاسی ریشہ دوانیوں، تحریک
آزادی کے مرحلوں اور جدو جہد میں سب سے زیادہ ہلاکت، تباہی
اور تاراجی محنت کش انسانوں کا مقدر رہی ہے۔ عبداللہ حسین کے تاریخی
شعور نے اس پہلو پر زور دے کر ناول کو حقیقت نگاری اور فن حسن کی نئی
اقدار سے روشناس کرایا ہے۔''(6)

اس سلسلے میں دیوندر اسّر کا یہ خیال بھی قابل لحاظ ہے:
جس میں عہد حاضر کے اضطراب اور التہاب کی نشاندہی کی گئی ہے۔
''اداس نسلیں'' ہندوستانی تاریخ کے ایک اہم دور ۴۷-۱۹۱۳ء

> کو پیش کرتی ہے ۔ اس میں تواریخ...... ایک مربوط ڈھانچے میں منتقل ہوگئے ہیں۔ ناول میں زبانی جذبات واحساسات کو بڑے جاندار طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔ ''اداس نسلیں'' ہمارے دور کی بے چینی اور ذہنی کرب............ آزادی کے بعد جن تین چار ناولوں کوادبی اہمیت حاصل ہے،'اداس نسلیں'، ان میں ایک اہم ناول ہے۔''(7)

ڈاکٹر قمر رئیس اور دیوندراسر نے جس تاریخی شعور کا حوالہ دیا ہے وہ قرۃ العین حیدرؔ کے ناول ''آگ کا دریا'' میں بھی موجود ہے ۔مگر ان دونوں فنکاروں نے تاریخی صداقتوں اور تاریخی واقعوں سے مختلف رنگ میں استفادہ کیا ہے۔عبداللہ حسین نے تاریخی شعور اور افراد کی نفسیات کو ہندوستانی کلچر کی مختلف لہروں سے منسلک کر دیا ہے۔'آگ کا دریا' میں قرۃ العین حیدر نے ثقافتی پہلو پر زیادہ زور دیا ہے اور سیکڑوں برس میں پھیلے ہوئے مختلف تہذیبی ادوار کوایک مسلسل تاریخی شعور کے آئینے میں پیش کر دیا ہے ۔عبداللہ حسین کے ناول میں انسان کے تہذیبی وجود کو بنیادی حیثیت حاصل نہیں ہے۔ خدیجہ مستور کے ''آنگن'' اور عبداللہ حسین کے''اداس نسلیں'' ذ دونوں ہی میں آزادی سے قبل کے محکوم اور غیر منقسم ہندوستان کے سیاسی اور معاشرتی حالات کو خام مواد کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ڈاکٹر انور پاشا نے اس کی نشاندہی کی ہے:

> ''اداس نسلیں'' میں عبداللہ حسین بھی ماضی کی تاریخی وتہذیبی فضا میں سانس لیتے ہیں۔انہوں نے بھی تقسیم سے قبل کی مشترکہ معاشرت اور تہذیب وثقافت کی ہی تصویر کشی اپنے ناول میں کی ہے۔''(8)

''اداس نسلیں'' کی کہانی ہندوستانی معاشرے سے براہ راست متعلق ہے۔پہلی جنگ عظیم سے لے کر ملک کی تقسیم تک کے واقعات اور سیاسی تغیرات وتحریکات کو پیش کیا گیا ہے۔

اس ناول کا قصہ پہلی جنگ عظیم سے کچھ پہلے کے ماحول سے شروع ہوتا ہے۔ ناول نگار نے جنگ سے متعلق کیفیتوں کی اور جنگ میں شریک فوجیوں کی جذباتی اور نفسیاتی الجھنوں کی بڑی مؤثر اور دلکش ترجمانی کی ہے

نعیم کے کردار میں وسعت اور ہمہ گیری پیدا ہوجاتی ہے۔ جرمنوں کے خلاف ہندستانی فوج انگریزوں سے قدم سے قدم ملا کر لڑتو رہی ہے مگر ان ہندستانی فوجیوں کو یہ نہیں معلوم کہ جرمنوں نے ان کا کیا بگاڑا ہے۔ جرمنوں کے خلاف جنگ میں انہیں کیوں اترنا پڑا؟ ناول نگار نے نہایت فن کارانہ چابک دستی اور ناوابستگی کے احساس کے ساتھ اس طرح کے ذہنی الجھنوں کو نمایاں کیا ہے۔

مصنف نے اس ناول میں تنگ نظری اور عصبیت سے بلند ہوکر انسان کے دکھ درد کو محسوس کیا ہے اور انسانی مسئلے کو غیر جذباتی ہوکر پیش کر دیا ہے۔ اس ناول کے چاروں ابواب ہندوستان کی غلامی، آزادی، بٹوارے اور انجام کو لے کر اسے تکمیل تک لے جاتے ہیں۔ ناول کے اصل ابواب کے نام کچھ یوں ہیں۔

پہلا باب ''برٹش انڈیا'' جس میں انگریزوں کی سامراجی قوتوں کے ہاتھوں مجبور و محکوم ہندستان کو دکھایا گیا ہے۔ دوسرا باب ''ہندستان'' کے عنوان سے ہے جس میں آزادی کی جدوجہد اور اس کے وصول کے لئے دی گئی قربانیوں اور مشکلات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ تیسرا باب ''بٹوارہ'' کے عنوان سے ہے۔ جس میں ملک کی تقسیم جیسے دل خراش اور دل سوز المیے کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ چوتھا اور آخری باب ''اختتامیہ'' کے عنوان سے شامل ہے۔ جس میں بٹوارے کے ہولناک نتائج اور فرقہ وارانہ فسادات سب کو موضوع بنایا ہے۔

ہندستانی عوام کی غلامانہ ذہنیت سے شروع ہوکر یہ ناول جدوجہد آزادی اور وصول آزادی کی خوشخبری سے ہوتے ہوئے فرقہ وارانہ فسادات کی نظر ہو جاتا ہے۔

عبداللہ حسین نے مہاجرین کے قافلے کی نہایت مکمل اور متحرک تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے۔ پھر لطف یہ ہے کہ تفصیل کے ساتھ اس مسئلے پر لکھنے کے باوجود ان کے طرز تحریر کا توازن اور اعتدال برقرار رہا ہے۔ ناول نگار نے نفرت اور حقارت کے مقابلے میں محبت کو ترجیح دی ہے۔ نفاق اور کینہ پر اخوت اور بھائی چارگی کو اہمیت دی ہے۔ جنگ کے مقابلے میں امن انہیں زیادہ عزیز ہے۔ اور مذہبی تعصّبات سے بلند ہوکر انسان دوستی کی انہوں نے تلقین کی ہے۔ ''اداس نسلیں'' میں واقعات و تجربات کے مختلف ماحول ہیں اور ناول نگار نے ہر واقعے اور تجربے سے متعلق ماحول کا سچا رُخ پیش کیا ہے۔ معاشرے کی صرف خارجی سطح کی عکاسی پر انہوں نے انحصار نہیں کیا ہے۔

معاشرے میں پرورش پانے والے مختلف میلانات اور رجحانات کی بھی انہوں نے خوبصورت انداز میں وضاحت کردی ہے ۔ پاکستان کے معاشرے کی مختلف سرگرمیوں کی پیش کش کے دوران ناول نگار نے مذہب کو ایک غیر ضروری یا کم ضروری چیز تصور کیا ہے ۔ وہ ایک ایسے صالح معاشرے کی تعمیر کا خواہاں نظر آتا ہے جس میں نظریاتی تعصّبات اور مذہبی تنگ نظری نہ ہو، جس کی بنیاد عقل سلیم پر رکھی گئی ہو اور جہاں مختلف فرقوں اور مذہبوں کے لوگ ایک جذبۂ اخوت ومحبت سے رہتے ہوں ۔

(ب) قرۃ العین حیدر

قرۃ العین حیدر ۱۹۲۷ء سے ۲۰۰۷ء تک:

قرۃ العین حیدر اُردو کی ایک ممتاز فکشن نگار ہیں۔ جن کی ادبی حیثیت غیر معمولی ہے۔ انھوں نے اپنی محنت ،لگن اور قابلیت سے اردو فکشن کو بین الاقوامی ادب کے مدمقابل کھڑا کردیا۔ انتظار حسین کے معاصرین میں قرۃ العین حیدر واحد ایسی فکشن نگار ہیں جن کا افسانوی کینوس بہت پھیلا ہوا ہے۔ قرۃ العین حیدر کی تاریخ پر بہت گہری نظر ہے۔ ان کی ولادت ۲۰؍جنوری ۱۹۲۷ء کو علی گڑھ کے ایک باشعور اور علمی وادبی گھرانے میں ہوئی۔ ان کی تاریخ پیدائش طے نہیں ہے۔ وہاب اشرفی نے اپنی کتاب تاریخ ادب اُردو میں ان کی تاریخ ولادت کے ذیل میں ڈاکٹر جمیل اختر کا رسالہ ''آجکل'' اگست ۲۰۰۵ء کے ایک مضمون بہ عنوان ''قرۃ العین حیدر'' کو نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''قرۃ العین حیدر نے یوپی کے ایک معزز اور اعلیٰ تعلیم یافتہ گھرانے میں آنکھ کھولی ان کی پیدائش ۲۰؍جنوری ۱۹۲۶ء کو بہ مقام علی گڑھ میں ہوئی۔ لیکن اس تاریخ پیدائش میں اختلاف ہے......

.... چند واقعات وشواہد کی بنیاد پر ان کی پیدائشی کا سن ۱۹۲۱ء۔۱۹۲۷ء قرار پاتا ہے۔ ایک تو یہ اپنے اکلوتے بھائی سے عمر میں سات سال چھوٹی تھیں اور ان کے بھائی کا سن پیدائشی بھی یہی کوئی ۱۹۱۹ء۔۱۹۲۰ء ہی ہے۔ اس لحاظ سے بھی ۱۹۲۶ء، ۱۹۲۷ء قرار پاتا ہے۔ دوسرا سب سے اہم واقعہ وہ ہے جب ۱۹۴۱ء میں عینی نے میٹرک پاس کیا اور ان کا داخلہ کالج میں ہونے کے لئے سولہ سال کی عمر کا ہونا ضروری تھا۔ بقول قرۃ العین حیدر:

> ''ابا جان نے اسکول کے فارم پر ۲۰؍جنوری ۱۹۲۷ء لکھ رہا۔
> اس ۲۰ جنوری ۱۹۲۷ء کو عینی کی تاریخ پیدائش زیادہ لوگوں نے قرار دیا ہے

............لہٰذا اس بیان کو معتبر مانتے ہوئے اس کول کے فارم میں لکھی
ہوئی تاریخ پیدائش مان لینے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔''(9)

قرۃ العین حیدر کے والد محترم سید سجاد حیدر یلدرم بھی پریم چند کے ہم عصر افسانہ نگاروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کی والدہ نذر سجاد بھی ایک اچھی افسانہ نگار تھیں۔ ایسے علمی ماحول میں رہ کر قرۃ العین حیدر کی تخلیقی صلاحیت اپنے والدین کے زیر سایہ تیزی سے بالیدہ ہوگئی۔ قرۃ العین حیدر کا پہلا افسانوی مجموعہ''ستاروں سے آگے'' مکتبہ جدید لاہور سے ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ ''شیشے کے گھر''۱۹۵۴ء میں''پت جھڑ کی آواز''۱۹۶۶ء میں، فصل گل آئی یا اجل آئی''۱۹۶۸ء میں،''روشنی کی رفتار''۱۹۸۲ء میں منظر عام پر آچکے ہیں۔

افسانوی مجموعوں کے علاوہ انھوں نے ملک کی تقسیم کے بعد ناول نگاری میں بھی اپنے جوہر دکھائے۔ انھوں نے''میرے بھی صنم خانے''۱۹۴۷ء میں تخلیق کیا۔اس کے بعد''سفینۂ غم دل''۱۹۵۳ء،''آگ کا دریا'' ۱۹۵۹ء،''آخری شب کے ہمسفر''۱۹۷۱ء،''کارِ جہاں دراز ہے''۳ حصوں پر مشتمل (۱۹۷۰ء،۱۹۷۹ء،۲۰۰۲ء) ،''گردش رنگ چمن''۱۹۸۸ء میں اور''چاندنی بیگم''۱۹۸۹ء میں منظر عام پر آئے۔ اس کے علاوہ ان کے چھ ناولٹ بھی ہیں۔ چار ناولٹ کا مجموعہ ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا۔ جس میں''چائے کے باغ''،''اگلے جنم موہے بیٹانہ کیجو''،''دل ربا'' اور''سیتا ہیرن'' ہیں۔ ایک ناولٹ''ہاؤسنگ سوسائٹی''۱۹۷۴ء میں شائع ہوا۔ اور''فصل گل آئی یا اجل آئی''۱۹۷۵ء میں

تقسیم ہند کے بعد ان کا خاندان پاکستان ہجرت کر گیا۔ وہ لکھنؤ کالج میں انگریزی کی لکچرر ہوچکی تھی۔ پاکستان ہجرت کے بعد وہاں اطلاعات ونشریات سے وابستہ ہوگئیں پھر لندن روانہ ہوگئیں اور وہاں جا کر پاکستان ہائی کمیشن لندن میں انفارمیشن افسر بن گئیں، لیکن جلد ہی اس عہدے سے مستعفی بھی ہوگئیں۔ لندن ہی سے انہوں نے صحافت کا ڈپلوما بھی کیا، لیکن ۱۹۵۹ء میں یعنی ہندستان لوٹی اور یہاں بی بی سی سے وابستہ ہوگئیں۔ آخری عمر تک ہندستان میں ہی رہی۔ یہ نامور اور نادر آفتابِ علم ۲۰۰۷ء میں ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا۔

قرۃ العین حیدر موضوع اور مواد کے لحاظ سے اپنے ہم عصروں سے الگ نظر آتی ہیں۔ تقسیم کے بعد ان

کے موضوعات میں کافی تنوع آیا۔ تقسیم کے بُرے نتائج ،ہجرت ، بے وطنی کا احساس ،سرحد کے دونوں طرف انسانوں کی ذہنی کشمکش ،اونچی سوسائٹی کا تہذیبی واخلاقی زوال ، سیاسی وسماجی اقدار کا کھوکھلا پن ،طبقاتی تضادات ، رومانیت سے گریز، وقت کا جبر اور تمام موضوعات کو انہوں نے جس فنی مہارت سے اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے، وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ ۱۹۶۰ء کے بعد قرۃ العین حیدر کا شمار اردو کے ممتاز ترین افسانہ نگاروں میں ہونے لگا تھا۔ وہ اردو کے ان بڑے فنکاروں میں شامل تھیں جن کا کینوس بہت وسیع تھا۔ ایسا کوئی ثقافتی اور تمدنی موضوع نہیں تھا۔ جس پر انہوں نے قلم نہ اٹھایا ہو۔ اپنے اس وسیع تناظر میں وہ تاریخ وتہذیب کے پس منظر کے ساتھ ساتھ انسان کی کائناتی بے سروسامانی کو شدت کے ساتھ نمایاں کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔

قرۃ العین حیدر تاریخ ،تہذیب وتمدن پر عالمانہ گرفت رکھتی ہیں۔ وہ بیک وقت ماضی اور حال دونوں میں سانس لیتی ہیں اور اپنے تاثرات اور جذبات کو اپنی تخلیقات میں شامل کرتی ہیں۔ ان کے اکثر افسانے خاصے طویل ہوتے ہیں چونکہ وہ جس تہذیبی ،سماجی اور تاریخی پس منظر کے سہارے کہانی کا تانا بانا بنتی ہیں اس کے لئے افسانے کا قالب کم پڑتا نظر آتا ہے۔ دراصل ان کی تخلیقات کسی ایک فرد یا واقعہ تک محدود نہیں ہوتیں، بلکہ ان میں وہ پورے معاشرے ،قوم اور ملک کی تاریخ ،تہذیب اور ثقافت کی عکاسی کرتی ہیں۔ قرۃ العین حیدر کی تخلیقات کو اقدار کی شکست وریخت کی تاریخ بھی کہا جاسکتا ہے۔ اس شکست وریخت کو وہ صرف دو لفظوں میں بیان نہیں کرتیں ، بلکہ ایک ایسی فضا تیار کرتی ہیں کہ قاری خود ان قدروں کے خاتمے کا عینی شاہد نظر آتا ہے۔ قرۃ العین حیدر عالمی ادب خصوصاً مغربی ادب سے گہری واقفیت اور وابستگی رکھتی تھیں۔ چوں کہ بذات خود وہ بے پناہ صلاحیتوں کی مالک تھیں، اس لئے ان کی ناولوں اور افسانوں میں نئی قدروں کی خوبصورت اور مستحکم بنیاد ملتی ہے۔

ڈاکٹر احسن فاروقی رقم طراز ہیں:

> ''اردو ناول نگاروں میں قرۃ العین حیدر پہلی فرد ہیں جنھوں نے ناول کو جدید فن کی خوبیوں سے معمور کیا۔ ''شعور کی رو'' کی تکنیک سے پورے طور پر واقف ہی نہیں بلکہ ان کی فطرت کو بھی اس تکنیک سے

مناسبت ''شعور کی رو'' کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ شکل ہے۔''(10)

قرۃ العین حیدر کے پہلے افسانوی مجموعے ''ستاروں سے آگے'' کے افسانوں میں اسکولی زندگی کی ہنگامہ آرائیاں ہیں۔ ''ستاروں سے آگے'' اور ''شیشے کے گھر'' کے افسانوں کے درمیان بچپن سے بلوغیت کی ایک لمبی جست ہے۔قرۃ العین حیدر کے افسانوی سفر کا دوسرا دور یہیں سے شروع ہوتا ہے۔اس زمانے میں تقسیم ملک اور ہجرت کا بہت بڑا سانحہ پیش آیا۔انسانی رشتوں کا انہدام کے ساتھ ہی دونوں طرف مہاجرین کے ساتھ برابرتاؤ کیا گیا۔قرۃ العین حیدر بھی ہندستان کو خیر آباد کہہ کر پاکستان میں مہاجر کی زندگی گزارنے لگیں۔زندگی کی یہی اداسی اور المنا کی ''شیشے کے گھر'' کے افسانوں میں موجود ہے۔تقسیم ہند کے تیرہ برس بعد وہ واپس ہندستان آ گئیں اور اسی دوران ان کا تیسرا مجموعہ ''پت جھڑ کی آواز'' منظر عام پر آیا جس میں تیرہ برس کی جلاوطنی سکھ دکھ کے، بھولے بسرے ہواؤں کی کھوج اور گمشدہ تہذیب کی کھوج کے عمل کا تجربہ ہے۔قرۃ العین حیدر کے موضوعات کسی پروپیگنڈہ کے تحت سوچے سمجھے ہوئے نہیں تھے۔وہ بے تکلفی کے ساتھ افسانے کا آغاز کر دیتی ہیں۔قرۃ العین حیدر کی بے تکلفی یہ ہے کہ وہ فرسودہ افسانوی آرٹ سے احتراز کرتی ہیں۔

قرۃ العین حیدر کے افسانے ایک طرح کے نہیں ہیں۔ جیسے جیسے ان کا ذہن بالیدگی کی منازل طے کرتا ہے۔کہانیاں بھی زیادہ ثقافتی اور فکری بنتی چلی جاتی ہیں۔انھوں نے اپنے فنکاری جوہر کا مظاہرہ کرکے اردو فکشن نگاری کو پرواز کی نئی جہتوں سے آشنا کرایا ہے۔اس لئے احسن فاروقی ان کے بارے میں یہ تسلیم کرتے ہیں کہ:

> ''قرۃ العین حیدر، ورجینا ولف سے تین باتوں میں آگے نکل جاتی ہیں۔ایک یہ کہ ان کا ناول بڑا وسیع زمانہ گھیرتا ہے دوسرا یہ کہ اس میں تنوع بہت زیادہ ہے اور تیسرے یہ کہ تعمیر میں انہوں نے وہ کمال دکھایا ہے کہ ان کو جینیس کہنا پڑتا ہے۔''(11)

تقسیم ہند کے المیے کے موضوع پر ہر بڑے فنکار نے افسانے لکھے۔اس سلسلے میں قرۃ العین حیدر نے اپنا

مشہور افسانہ ’’جلاوطن‘‘ لکھا جو کہ ۱۹؍ابواب پر مشتمل ہے۔ اس افسانے میں ۱۹۴۷ء کے فسادات، ان کی وجوہات، اس کے سماج پر پڑنے والے اثرات اور تقسیم سے قبل کے حالات کا کافی گہرائی سے مطالعہ کیا گیا ہے۔ سیاسی اور سماجی حالات کس طرح انسانی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں، کس طرح دو تہذیبیں آپس میں ٹکراتی ہیں۔ اور انتشار کا شکار ہوتی ہیں۔ اس کا موثر بیان اس افسانے میں پیش کیا گیا ہے۔ افسانہ ’’جلاوطن‘‘ میں برصغیر ہند کے ہندو مسلم گھرانوں کی باہمی یگانگت، خلوص و محبت کے تذکرے کے ساتھ ہی تقسیم کے بعد رانما ہونے والی تبدیلیوں کے واضح اثرات ملتے ہیں اور اس کے کردار اپنے عہد کی بیکراں تنہائی اور زندگی کے پچھتاؤں میں جلاوطنی کی زندگی کا جبر سہتے نظر آتے ہیں۔ اس افسانے میں کشوری، کھیم وتی، کنول کماری اور آفتاب رائے اہم کردار ہیں، پوری کہانی انہیں کرداروں کے ارد گرد گھومتی ہے۔

عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ اردو فکشن میں قرۃ العین حیدر کا کام اس لفظۂ نظر سے زیادہ وسیع اور نادر ہے کہ وہ اپنے افسانوں میں جو وسیع پس منظر چھوڑتی ہیں۔ یا وسیع دائرہ بنا کر افسانہ بنتی ہیں۔ اس میں ان کا کوئی ہم عصر نہیں ہے۔ واقعات اور بیانیہ کے پھیلاؤ کے باوجود ان کا ارتکا کہیں ٹوٹنے نہیں پاتا۔ وہ اپنے موضوع سے متعلق سبھی جزئیات پر گہری نظر رکھتی ہیں۔ ان کی حقیقت نگاری گہری، دیرپا اور دلائل کی سطح پر استوار ہوتی ہے۔ انتظار حسین کے معاصرین میں قرۃ العین حیدر کا نام ایسا ہے، جسے اردو کی ادبی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

خدیجہ مستور

۱۹۲۷ء سے ۱۹۸۲ء تک

خدیجہ مستور کی ولادت لکھنؤ (بریلی)، برطانوی ہندستان میں۱۲/دسمبر ۱۹۲۷ء کو ہوئی ان کے والد کا نام ڈاکٹر تہور احمد خان تھا۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔۱۹۳۶ء میں اسکول میں داخلہ لیا۔ والد کے انتقال کے بعد ان کی مالی حالت خستہ ہوئی۔ چونکہ ان کے سات بھائی بہن تھے۔لہٰذا فاقوں تک کی نوبت آ گئی۔اس مشکل گھڑی میں ان کے ماموں آگے آئے اور ان لوگوں کی مدد کرتے رہے، مگر جلدی ہی ان کا بھی انتقال ہو گیا۔

اتفاق کی بات یہ ہے کہ خدیجہ کی ملاقات شوکت تھانوی سے ۱۹۳۶ء میں ہوئی۔انھوں نے خدیجہ کی خوب حوصلہ افزائی کی اور لکھنے کی طرف ان کی توجہ مبذول کی۔اس طرح ۱۹۴۲ء سے باضابطہ افسانے لکھنے شروع کئے۔ ان کی ابتدائی کہانیاں ''خیام'' اور ''عالم گیر'' جیسے رسالوں میں شائع ہوتی رہی۔ یوں بھی ادبی ماحول ان کو ورثے میں ملا تھا۔ ان کے والدین ادب سے گہرا شغف رکھتے تھے۔ یہ صورت بھی انھیں لکھنے لکھانے کی طرف مائل کرتی رہی۔۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے بعد خدیجہ اپنے خاندان کے ساتھ لاہور ہجرت کر کے وہاں مقیم ہوئیں۔

خدیجہ مستور کی شادی ۱۹۵۰ء میں ظہیر باہر سے ہوگئی۔اس کے بعد ان کی مالی پریشانیاں تقریباً دور ہو چکی تھیں۔لہٰذا ۱۹۵۴ء سے ایک اعتماد کے ساتھ لکھنے لگے۔ان کی تخلیقات میں ناول اور افسانے شامل ہے۔ان کے دو مشہور ناول جس میں ''آنگن'' ۱۹۶۲ء میں چھپ کر سامنے آیا اس ناول پر انھیں آدم جی ادبی انعام سے نوازا گیا۔جبکہ دوسرا ناول ''زمین'' جو ۱۹۸۳ء میں ان کی وفات کے بعد شائع ہوا۔اس کے علاوہ انھوں نے افسانہ نگاری میں اپنا لوہا منوایا۔ ان کے پانچ افسانوی مجموعوں میں ''کھیل'' ۱۹۴۴ء، ''بوچھاڑ'' ۱۹۴۶ء، ''چند روز اور'' ۱۹۶۰ء، تھکے ہارے'' اور ''ٹھنڈا میٹھا پانی'' ۱۹۸۱ء میں پے در پے شائع ہو کر بیسویں صدی کے اردو فکشن کی زینت بنتے گئے۔

خدیجہ مستور اپنی زندگی کے آخری دنوں میں کافی علیل رہتی تھیں آخر ۲۶؍ جولائی ۱۹۸۲ء کو ۵۵ برس کی عمر میں ان کی وفات لندن میں ہوئی۔ اور پاکستان کے شہر لاہور میں گلبرگ کے قبرستان میں آسودۂ خاک ہوئیں۔

خدیجہ مستور یوں تو افسانہ نگار ہیں لیکن ان کی اصل شہرت کا سہرا ان کے ناول ''آنگن'' کو حاصل ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں زیادہ تر وہی مسائل زیر بحث لائے ہیں جو عورتوں کے مسائل کہے جاسکتے ہیں۔ معاشرتی تضادات اور عورت کی مظلومیت کو اپنے افسانوں میں خصوصی اہمیت دی۔ دراصل یہ نظام عورتوں کو ایک خاص طرح کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کرتا ہے جس کے خلاف آواز اٹھائی جاتی ہے۔ عورتوں پر سماج کے اندر ڈھائے جانے والے مظالم کو عموماً خواتین افسانہ نگار ایک خاص لب ولہجے سے پیش کرتی رہی ہیں۔ ان میں خدیجہ مستور بھی ہیں۔ خدیجہ نے بھی اپنے افسانوں میں اس بات کو خاص طریقے پر برتنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ مردوں کے بارے میں عورتوں کا موقف ایک طرفہ رہا ہے۔ ان کی ایک کہانی کے بارے میں ممتاز حسین یوں رقمطراز ہیں۔

> ''وہ اپنے ایک افسانے میں جس کا عنوان ہے ''تین عورتیں'' عورتوں پر کئے جانے والے یا عورتوں پر گزرنے والے تین قسم کے ظلم بیان کرتی ہیں۔ قدسیہ، ذکیہ دو بہنیں ہیں۔ قدسیہ اپنی محبت میں ناکام رہتی ہے۔ وہ اس ناکامی کو اپنی تذلیل سمجھتی ہے۔ ذکیہ کو اس کا شوہر شادی کے ایک سال بعد طلاق دے دیتا ہے۔ اس سے اس کا دل مردوں کی طرف سے اچٹ جاتا ہے۔
>
> تیسری عورت ان دونوں کی بھابھی ہے۔ جس کے بارے میں ذکیہ یوں کہتی ہوئی نظر آتی ہے۔ جب تمہاری جیسی حسین گریجویٹ سے محبت کے بعد شادی کی جاتی ہے اور اسے اس ترقی کے دور میں سات سال کے اندر چھ بچوں کی ماں بنا کر تنہا بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے۔

تمہارے نظام نے تمہاری دنیا کو مرد کی محبت اور نفرت کے دائرے میں قید کر رکھا ہے۔
عورت کی رہائی مرد کی محبت اور نفرت کی قید سے اس وقت ممکن نہیں جب تک یہ نظام خواہ وہ جاگیردارانہ ہو یا بورژوائی، قبائلی ہو یا نیم قبائلی، بدلا نہ جائے۔''(12)

خدیجہ مستور کے افسانے عورتوں کی کسم پرسی کے افسانے ہیں جس میں وہ ایک خاص انداز سے جوجھتی رہی ہیں۔ ان کے بعض افسانوں میں نچلے اور متوسط طبقے کے کرداروں کو ان کے مسائل سے ابھارا ہے۔ خواتین کی حیثیت، نفسیات اور مسائل ان کا پسندیدہ موضوع ہے۔ ایک خاتون ہونے کے ناطے فطری طور پر خدیجہ کی ہمدردیاں عورت کے ساتھ ہیں۔ ان کے افسانوں کے پہلے مجموعے ''کھیل'' کا پہلا افسانہ عورت کی وفا اور مرد کی بے وفائی کے پس منظر میں ہے اور ان کا آخری افسانہ ''بھروسہ'' بھی اس موضوع پر ہے۔ خدیجہ مستور کی فکشن نگاری پر وہاب اشرفی یوں رقمطراز ہیں:

''میں سمجھتا ہوں کہ ایک فکشن نگار کی حیثیت سے خدیجہ مستور کی ایک جگہ اور یہ جگہ بے حد اہم ہے۔''(13)

خدیجہ مستور کی ایک حیثیت ناول نگار کی بھی ہے۔ ان کے ناول ''آنگن'' نے ادبی حلقوں میں بہت مقبول سمیٹی۔ خدیجہ مستور کا شمار ان خاتون ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔ جنھوں نے اپنی تخلیقی ذہانت اور فنکارانہ شعور کے ذریعے ناول نگاری کے فنی معیار کو بلند کیا اور اس کے صنفی وقار میں اضافہ کیا۔ خدیجہ مستور کا ناول ''آنگن'' ایک متوسط طبقے کے مسلم گھرانے کے آنگن کے مسائل کی بنیاد پر لکھا گیا ہے۔ لیکن گھر کی چہار دیواریوں میں محدود یہ آنگن برصغیر کے ہر گھر کا آنگن بن گیا ہے۔ جہاں گھریلو مسائل بھی ہیں اور گھر سے باہر رونما ہونے والے مسائل کی آہٹیں، ان کے اثرات اور نتائج بھی۔ ''آنگن'' ایک ایسے خاندان کی کہانی ہے جو اتر پردیش کے علاقے میں دوسری جنگ عظیم سے قبل آرام اور سکون کی زندگی گذار دیا تھا۔ اس کی خوش حالی اور آسودگی عام معاشرتی محرومیوں

سے محفوظ تھی۔ ناول نگار نے بڑی احتیاط اور خوبصورتی سے اس خاندانی ماحول اور معاشرہ کی عکاسی کی ہے۔ حالات کی تبدیلی، سماج تغیرات، پرانے اصولوں یا تصورات کی شکست وریخت اور نئے معاشرتی مسائل کے فروغ کے نہایت شفاف نقشے سامنے آتے ہیں۔ یہ خاندان فطری طور پر نئے رجحانات سے متاثر ہوا۔ تحریک آزادی کی شدت اور عوامی اضطراب بڑھا تو اس گھر کے لوگ بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکے۔ گھر کا ماحول گاندھی جی، جناح اور نہرو کے نام اور کام سے آشنا ہوتا چلا گیا۔ تقسیم کے اس پس منظر اور اس سے پیدا شدہ صورت حال کو مصنفہ نے بڑی فنکاری سے پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر اسلم ''آزاداس'' ناول سے متعلق یوں رقمطراز ہیں:

> ''آنگن، اپنے تاریخی موضوع، تہذیبی سچائی، فنی پختگی اور فکری شعور کے باعث میرے خیال میں اردو ادب کا سب سے اچھا اور شاہکار ناول ہے جس نے خدیجہ مستور کو دنیائے ادب میں جاوداں بنادیا ہے۔''(14)

(ج) رامانند ساگر، رام لعل، جوگندر پال

<u>**رامانند ساگر ۱۹۱۷ء سے ۲۰۰۵ء تک**</u>: بھارتی فلم انڈسٹری کے معروف فلم ساز، ہدایت کار، کہانی نویس، ہجرت کا ذاتی تجربہ رکھنے والے ''اور انسان مرگیا'' کے خالق راما نند ساگر ۲۹/ دسمبر ۱۹۱۷ء کو لاہور (موجودہ پاکستان) میں پیدا ہوئے۔ انھیں بھارتی ٹی وی کی مشہور اساطیری سیریل 'رامائن' کی تخلیق پر بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ راما نند ساگر انتظار حسین کے ایک ایسے ہم عصر مصنف ہے جنھوں نے اپنے کیئریر کا آغاز بطورِ فلم ٹیکنیشن کیا تھا اور ممبئی کی فلم نگری میں ترقی کرتے کرتے وہ ایک ممتاز فلمساز بن گئے تھے۔ موصوف نے پچیس سے زیادہ فلمیں اور ایک درجن سے زیادہ ٹی وی ڈرامے بنائے۔ ان کی چند یادگار فلموں میں مہانسانیت، کوہ نور، پیغام، گھونگھٹ، زندگی، آنکھیں، للکار، آرزو، گیت اور بغاوت کے نام آتے ہیں۔

انھوں نے ساگر جی کے ساتھ فلم 'سلمیٰ' میں کام کیا۔ جس میں ہیروئین پاکستانی اداکارہ ''سلمیٰ آغا'' اور ہیرو ''راج ببر'' تھے۔ اس فلم کے نغمے حسن کمال نے ہی لکھے تھے۔ ساگر کو اردو زبان سے بے حد لگاؤ تھا۔ وہ ایک اچھے ناول نگار اور افسانہ نگار بھی تھے۔ ان کا اکلوتا ناول ''اور انسان مرگیا'' اور اکلوتا افسانوی مجموعہ ''جوار بھاٹا'' ہی ان کو بیسویں صدی کے معروف فکشن نگاروں میں شامل کرنے کے لئے کافی ہے۔ ان کا ناول ''اور انسان مرگیا'' ۱۹۴۸ء برصغیر کی تقسیم اور قیام پاکستان پر ہی لکھا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے افسانوی مجموعے ''جوار بھاٹا'' ۱۹۴۴ء میں سترہ افسانے شامل ہیں جن میں کلرک، جاہل، وزیر اعظم، بڑا بھائی، چھوٹا بھائی، غلامی، موت کے بستر سے وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

۱۲/دسمبر ۲۰۰۵ء بھارت کے شہر ممبئی میں طویل علالت کے بعد ۸۸ برس کی عمر میں انتقال کر گئے۔ خواجہ

احمد عباس ان کے ناول ''اور انسان مر گیا'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔ یہ کمرہ سرینگر کے ایک چھوٹے سے بنگلے میں تھا اور اس میں وہ مصنف اور شاعر، اخبار نویس، آرٹسٹ اور فوٹو گرافر جمع تھے جو ہندستان کے کونے کونے سے کشمیر کے جمہوری انقلاب کو مدافعتی جنگ کے شعلوں سے پیدا ہوتے ہوئے دیکھنے آئے تھے۔ ان میں ہندو بھی تھے مسلمان بھی اور سکھ بھی۔ وہ بھی تھے جو مغربی پنجاب میں اپنا سب کچھ کھو کر آئے تھے اور وہ بھی جن کی مشرقی پنجاب میں اپنے وطن کو خیر باد کہنا پڑا تھا۔ وہ سب فساد کی آگ سے جھلسے ہوئے تھے۔ ان میں سے بہت منہ موڑ چکے تھے اور انسانیت کی قبر پر فاتحہ پڑھ چکے تھے، انقلاب کا کریا کرم کر آئے تھے پھر بھی وہ سب کشمیر آئے کیوں کہ اس وقت انسان کی مہیب اور محیط تاریکی میں ہی ایک روشن کمرہ تھا جہاں انسانیت اور امید کی شمع ابھی تک روشن تھی، ٹمٹما رہی تھی، تند ہواؤں کے درمیان لرز رہی تھی......مگر روشن تھی......

جب اس کمرے میں داخل ہوا تو کوئی کچھ پڑھ رہا تھا۔ یہ راما نند ساگر تھا۔ رومان، عاشق مزاج، نفاست پسند فنکار راما نند ساگر جو چند ہی روز ہوئے شرنارتھیوں کے لئے کھسٹے قافلے کے ساتھ اپنے بال بچوں کو لے کر دہلی پہنچا تھا اور فوراً ہی ان کو وہاں چھوڑ کر کشمیر کے محاذ جنگ پر چلا آیا تھا۔ وہ اپنے ناول کا ایک باب سنا رہا تھا اور سننے والوں میں کچھ کسی خوفناک خواب میں کھوئے ہوئے تھے اور کچھ اپنے آنسوؤں کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے ناول کا نام تھا......''اور انسان مر گیا۔''

خواجہ احمد عباس کے منقول اقتباس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ تقسیم کے آس پاس کے دنوں میں عوامی ذہن پر یاسیت اور قنوطیت مسلط ہو چکی تھی اور لوگ انسانیت کے مستقبل سے مایوس ہو چکے تھے۔ البتہ ایک روشن شمع امید فردا کی طرح چمک رہی تھی۔ یہ شمع تھی وادیٔ کشمیر۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی دوستی، بھائی چارگی اور رواداری کی واحد علامت۔ یہ شمع بھی بجھ گئی تو پھر آگے خوفناک تاریک وادی نظر آ رہی تھی۔ چنانچے اس شمع کی حفاظت کے لئے چاروں طرف سے لوگ جوق در جوق اس طرف آ رہے تھے راما نند ساگر بھی، حالانکہ شرنارتھی کہ حقیقت سے لاہور سے دہلی آئے تھے مگر فوراً سری نگر پہنچ گئے۔ راما نند ساگر بھی مایوسی اور قنوطیت کا شکار ہوتے تو شاید کشمیر کا بھی رخ نہ کرتے اور اپنے حالات پر قانع ہو کر بیٹھ جاتے۔ ''اور انسان مر گیا'' کی بنیاد ان کے نوٹس Notes ہیں یہ نوٹس

انہوں نے ہنگامہ وحشر کے انہیں دنوں میں اکٹھا کیے ۔ان کی ایک حیثیت روداد سفر کی بھی ہے جو روداد حیات بن گئی ہے ۔اپنے ناول کے لئے وہ مختلف حالات میں نوٹس لیتے تو رہے لیکن جذباتی سکون انہیں فراہم نہ ہوسکا ۔خود لکھتے ہیں کہ:

''مجھے یوں معلوم ہورہا تھا کہ میرے نوٹس Notes بھی مکمل نہ ہوسکیں گے اتنا کچھ ہورہا تھا اور کتنا کچھ ہونے کو باقی تھا۔حتیٰ کہ ۱۵/ اگست کے بعد وہ قیامت بھی برپا ہوگئی جب ماں کو بیٹے کی خبر نہ رہی خاوند کو بیوی کی سدھ نہ رہی۔ لوگ آوارہ آندھیوں کی طرح بھٹکتے پھر رہے تھے۔ایک دوسرے کو پکار رہے تھے،لیکن کوئی کسی کو اپنی خبر تک نہ پہنچا سکتا تھا............اسی دوران میں ۱۵/اگست ۱۹۴۰ء کو میں نے یہ ناول ''فساد اور امن'' کے نام سے لکھنا شروع کر دیا تھا...... پہلے حصے لکھتا جارہا تھا اور ایک انجانے اختتام کے لئے Notes بھی لیتا جارہا تھا کیوں کہ میں یہ جان گیا تھا کہ حالات اس رفتار سے تبدیل ہورہے ہیں ۔ابھی سے اس کا کوئی پورا پلان تیار کر لینا سخت حماقت ہوگی۔''(15)

اس ناول کے بارے میں ڈاکٹر حسن کی یہ رائے قابل توجہ ہے:

''ساگر کے ناول یا فرقہ وارانہ فسادات کے مسئلے پر لکھے ہوئے کسی ناول کی کامیابی کا دار و مدار اس بات پر نہیں ہے کہ اس میں ہنگامی صورت حال کی دردمندانہ عکاسی کی گئی ہے یا فرقہ وارانہ فسادات کے المیے کی تصویر کشی ہوئی ہے۔ بلکہ ان کی کامیابی اس میں ہے کہ انسانی شخصیت کا سارا زہر ان ناولوں میں سامنے آیا۔ گہرائی سے دیکھا جائے تو یہ پوری صورت حالِ جو اس قسم کے ناولوں کیلئے عقبی زمین کا کام دے

رہی تھی۔ دراصل ہندستان کے ذہن اور دل ،ضمیر اور اندرونی شخصیت ،مزعومات اورعمل کی کشمکش تھی۔''(16)

بقول عصمت چغتائی:

''رامانندساگر کے کردار ذہنی، اخلاقی اور جسمانی خودکشی کر لیتے ہیں، پاگل ہوکر لوگوں کو کاٹنے دوڑتے ہیں اوراسی بات پر ہمدردی کے امیدوار نظر آتے ہیں۔'' میرا خیال ہے کہ ان کا یہ تاثر یک طرفہ ہے (17)۔

''اور انسان مر گیا'' ایک ہنگامی موضوع سے وابستہ ہے۔ اس کی بنیاد فرقہ وارانہ فسادات ہیں۔ یہ ناول ان فسادات میں مبتلا ہوکر اوران سے متاثر ہوکر لکھا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کی وجہ سے یہاں واقعات کا وہ تنوع، وسعت اور پھیلاؤ نہیں ملے گا جو بالعموم دوسری نوعیت کے ناولوں میں ملتا ہے۔ اس میں فرقہ وارانہ فساد ہی سے متعلق واقعے اور حادثے اکٹھا کر دیئے گئے ہیں۔ خود ناول نگار نے دیباچے میں اس کی وضاحت کی ہے کہ فسادات کے دوران جو نوٹس Notes تیار کئے گئے انہیں پر اس ناول کی بنیاد رکھی گئی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ رامانند ساگر کی زبان، اندازِ بیان اور مکالمہ نگاری کا سلیقہ اتنا پر اثر ہے کہ اس کے مناظر کو برداشت کرنا، اس کے واقعات کو بغیر کسی احساس کے پڑھ لینا تقریباً ناممکن ہے۔

مجموعی طور پر ناول کے پلاٹ میں ربط وضبط کم ہے چونکہ فسادات سے متعلق واقعوں اور حادثوں کو قلم بند کر کے ناول کا خاکہ تیار کیا گیا ہے اوراس کی بنیاد پر ناول لکھا گیا ہے۔ اس لئے اس کے قصے میں فطری ارتقاء نہیں ملتا۔ خود ناول نگار نے وضاحت کی ہے کہ ناول کے چار مختلف حصے ایک ہی وقت میں بڑھتے اور پھیلتے ہیں۔ ان چاروں حصوں کو پلاٹ سے منسلک رکھنے میں سب سے اہم کردار آنند نے ادا کیا ہے۔ آنند ان مختلف حصوں کی مشترک کڑی ہے۔ جذبات نگاری اس ناول کی سب سے اہم اورنمایاں صفت ہے۔ تاہم فساداتی ادب میں رامانند ساگر کے اس ناول کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

رام لعل ۱۹۲۳ء سے ۱۹۹۶ء تک

اردو کے اہم ترین افسانہ نگار، ناول نگار اور سفر نامہ نویس، تقسیم، ہجرت اور دوسرے انسانی المیوں کی کہانیاں لکھنے کے لئے معرف ''زرد پتوں کی بہار'' کے نام سے پاکستان یاترا کی کہانی کو سپرد قلم کرنے والے انتظار حسین کے یہ ہم عصر فکشن نگار بھی ہجرت کا ذاتی تجربہ رکھتے ہیں۔ ۱۹۲۳ء میں پاکستان کے موجودہ پنجاب میں پیدا ہوئے اور بھارت کے شہر لکھنؤ میں ۱۹۹۶ء کو انتقال کر گئے۔

رام لعل کا اصل نام رام لعل چھابرہ تھا۔ یہ ۳/ مارچ ۱۹۲۳ء کو میانوالی، پنجاب میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد لچھمن داس چھابرہ تھے۔ والدہ اسی وقت انتقال کر گئیں جب ان کی عمر دو سال تھی۔ ان کی پرورش سوتیلی ماں کے یہاں ہوئی۔ جن کا سلوک ہمیشہ ناروا رہا، ماں کی موت کا اثر رام لعل کو ہمیشہ رہا۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ:

> ''بچپن ہی سے ماں جیسی نعمت سے محرومی اور دوسرے لوگوں کی
> شفقت جس میں ترس کا مادہ زیادہ ہوتا تھا میرے اندر احساس کمتری کو
> بڑھانے کا باعث ہمیشہ بنتا رہا۔ جب میں نے ہوش سنبھالا گھر سے مفلسی
> رخصت ہو چکی تھی۔ اتنا بڑا گھر تھا جس کے تین حصوں میں میرے والد
> اور میرے دو چچا رہائش پذیر تھے۔''(18)

اپنی شادی کے سلسلے میں رام لعل کا بیان ہے کہ ان کا رشتہ ایک ایسے خاندان میں ڈھونڈ لیا گیا جہاں ان کی ہونے والی بیوی، بڑی بہن، اور ایک بڑا بھائی تپ دق میں مبتلا تھے لیکن اس کا اثر ان کی بیوی شکنتلا پر نہ پڑا۔ اور وہ صحت مند رہیں۔

ہائی اسکول کی تعلیم کے بعد رام لعل نے میکانیکل کام کی ٹریننگ لی۔ اس کے بعد کمرشیل ٹریننگ بھی حاصل کی۔ ایسی تربیت کی وجہ سے وہ ریل کے ملازم ہو گئے۔ ساری زندگی اسی محکمے سے تعلق رہا۔ ۱۹۸۱ء میں سبکدوش ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں جب ہندستان آزاد ہوا تو وہ میانوالی سے ہندستان آنے لگے۔ اس وقت وہ لاہور میں تھے۔ اپنے سفر کا حال انہوں نے یوں رقم کیا ہے:

> ''۱۹۴۷ء میں ہندستان کی آزادی کے وقت میرے لئے لاہور چھوڑ کر نئے ہندستان کی طرف کوچ کرنا ایک اہم واقعہ ہے۔ کیونکہ یہ سفر جس میں میرے ساتھ میری بیوی اور ایک چھوٹی سی بچی شامل تھی آگ اور خون کے سمندر پار کرنے کے برابر تھا۔ اپنی زندگی میں میں نے یوں تو کئی موتیں دیکھی ہیں لیکن جس قدر موتیں اور انسانی بے رحمی، بے حسی اور وحشت آزادی کے فسادات کے دوران میں دیکھی ہیں انہیں بھلانا مشکل لگتا ہے۔ مجھے فساد اور جنگ دونوں سے نفرت ہے لیکن میرے اندر کبھی کبھی غصہ اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ میں جذباتی طور پر خود کو بے شمار قتل کرتا ہوا محسوس کرتا ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ دنیا سے سارے سفاک لوگوں کا ایک مرتبہ خاتمہ کر دوں۔'' (19)

رام لعل کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۴۳ء میں ہوا۔ ان کی پہلی کہانی ''خیام'' ہے جو ویکلی لاہور میں شائع ہوئی تھی۔ موصوف نے اپنے فن کے بارے میں یوں اظہار کیا ہے جو بیحد اہم ہے۔

> ''میری ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۴۳ء میں ہو گیا تھا۔ جس میں میری پہلی کہانی 'خیام' ویکلی لاہور میں شائع ہوئی تھی۔ میں نے شروع ہی سے اپنے لئے دو ادبی رویے متعین کر لیے تھے۔ ایک تو اپنا نام بہت سادہ رہنے دیا تھا۔ یعنی اسے خواہ مخواہ بارعب بنانے کی کوشش نہیں کی

تھی۔ دوسرا میں نے افسانہ نگاری کے لئے ہمیشہ نیا ماحول، حقیقی کردار نگاری اور ان کہی باتیں پیش کرنا شعار بنائے رکھا ہے۔ ....
اگر چہ میں تعصب سے بہت دور بھاگتا ہوں اوراس طبقاتی تعصب سے بھی نجات حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں، لیکن انسانی فطرت کی اس خودغرضی کی جبلت کو سمجھنا اور اسے کہانیوں کے وسیلے سے پیش کرنے سے باز آنا کبھی کبھی بہت مشکل ہوجاتا ہے۔ میرا تعصب بھی میرے لئے ایک تخلیقی مسئلہ بن گیا ہے۔'' (20)

رام لعل زودنویس کہے جاسکتے ہیں۔ انہوں نے تقریباً تین سو افسانے لکھے ہیں۔ ناول، ناولٹ، ریڈیائی ڈرامے اسٹیج کے ڈرامے، مضامین اور خاکے، ان کا پہلا مجموعہ ''آئینے'' ۱۹۴۵ء میں شائع ہوئے۔ ''انقلاب آنے تک'' ۱۹۴۹ء ''نئی دھرتی پرانے گیت'' ۱۹۵۸ء، ''گلی گلی'' ۱۹۶۰ء، ''آواز تو پہچانو'' ۱۹۶۳ء، ''اکھڑے ہوئے لوگ''، ۱۹۷۲ء، ''گزرتے لمحوں کی چاپ'' ۱۹۷۴ء اور ''معصوم آنکھوں کا بھرم''، ۱۹۷۱ء، میں شائع ہوئے۔ انہوں نے ایک فرانسیسی ناول کا ترجمہ ''نیل دھارا'' کے عنوان سے کیا۔ ان کے دوسفر نامے ''زرد پتوں کی بہار'' اور ''خواب خواب سفر'' بالترتیب سفر نامہ پاکستان اور سفر نامہ یورپ ہیں۔ جو ۱۹۸۲ء اور ۱۹۸۳ء میں شائع وہئے ہیں۔ ''سورج جیسی رات'' ایک ناول ہے جو ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا۔ ان کی آخری تصنیف ''سدا بہار چاندنی'' افسانوں کا مجموعہ ہے جو ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا۔ اس سے پہلے اردو افسانے پر ایک تنقیدی کتاب ''اردو افسانے کی نئی تخلیق'' بھی شائع کی۔

یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ رام لعل ترقی پسند تھے لیکن سماج کی زبوں حالی انہیں ہمیشہ ستاتی رہتی تھی۔ نچلے طبقے پر ان کی خاص نگاہ تھی۔ انہوں نے زیادہ تر افسانے ایسے ماحول سے اخذ کئے جو پسماندہ اور پریشان حال افراد سے متعلق ہیں۔ انہوں نے رشتے ناتے پر بھی بڑی فنکاری سے نگاہ ڈالی ہے۔ ٹوٹتے بکھرتے رشتوں اور راہوں کے شکست وریخت سے ان کا دل ہمیشہ متاثر رہا ہے۔ نتیجے میں ان کے افسانے متوسط طبقے کے نمائندگی کا نشان بن

گئے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ انہیں دلتوں سے یا اس سماج کے لوگوں کی طرف خاص توجہ نہیں تھی لیکن متوسط طبقے کی فضا کو سامنے لانے میں اعلیٰ اور پست طبقے کے لوگ کسی نہ کسی طرح سامنے آ گئے ہیں۔ ان کے بعض افسانے ٹوپیکل مسائل سے جوجھتے نظر آتے ہیں۔ سامنے کی ایک مثال ان کا افسانہ ''ایک شہری پاکستان کا'' ہے۔ ہندستان کی تقسیم کے بعد اور پاکستان کے قیام سے ہجرت اور ترک وطن کے جو المناک سلسلے قائم ہوئے ان پر ان کی نگاہ رہی ہے۔ رام لعل جس طرح فساد اور جنگ سے نفرت کرتے ہیں اس کی وجہ بھی وہ تجربے اور مشاہدے ہیں جن سے وہ گزرے اور جن کا عکس ان کی تخلیقات میں موجود ہے۔

رام لعل ہمارے عظیم افسانہ نگاروں میں نہیں ہیں لیکن افسانہ نگاروں کی جو دوسری صف قائم کی جا سکتی ہے اس میں ان کی ایک اہم جگہ ہے۔ اس لئے بھی کہ فن پر بھی ان کی نظر خاصی تیز رہی ہے۔ ان کے اکثر کردار حقیقی معلوم ہوتے ہیں۔

رام لعل اس دور سے بھی گزرے جب ترقی پسندی کے بعد جدیدیت سکہ رائج الوقت ہو چکی تھی لیکن وہ تجرید اور ابہام سے ہمیشہ دور رہے اور اپنے فن کو اس راستے پر رکھا جو ان کی اپنی فکر کا نتیجہ تھی۔ گویا فیشن پرستی ان کے مزاج میں نہ تھی۔

جوگندر پال 1925ء

جوگندر پال ۵ ستمبر ۱۹۲۵ء کو سیالکوٹ، برطانوی ہند میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد کا نام لال چند سیٹھی تھا۔ وہ تقسیم ہند کے وقت بھارت آ گئے۔ ان کی مادری زبان پنجابی تھی تاہم ان کی ابتدائی وسطانوی تعلیم اردو ذریعہ تعلیم سے مکمل ہوئی اور یہی ان کے ادبی اظہار خیال کی زبان بنی۔

جوگندر نے ایم اے انگریزی ادب میں 1945ء کیا اور پیشہ درس وتدریس سے جڑ گئے۔ وہ مہاراشٹر کے ایک پوسٹ گریجویٹ کالج کے پرنسپل کے طور پر وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے۔

اردو ادب سے وابستگی

جوگندر کا یہ نقطہ نظر تھا کہ اردو ایک زبان نہیں بلکہ ایک تہذیب کی نمائندگی کرتی ہے اور ان کے لئے

تہذیب کا حصہ ہونا ادب سے وابستہ ہونا ہی تھا۔ وہ ترقی پسند تحریک کا حصہ تھے۔ ان کی افسانہ نگاری بھارت ہی میں نہیں بلکہ پاکستان کے ادبی حلقوں میں پذیرائی پائی۔ انہوں نے ایک بڑا عرصہ نیروبی میں گزارا۔ پورے ۱۴؍ برس وہاں رہے۔ اپنی ملازمت کے بارے میں خود لکھتے ہیں:

> ''ہمیں منزلوں تک پہنچانے میں اتفاقات کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ میں اورنگ آباد دکن پہنچنے کے لئے نیروبی سے روانہ ہوں؟ حیدر آباد میں جب عثمانیہ یونیورسٹی نے میری نوکری .... اور نگ آباد کے جی ایم شراف سے ہوگئی۔ انہوں نے میری تھرڈ کلاس کی سٹیفکیٹ سے پگھل کر مجھے اورنگ آباد میں سرسوتی بھون کالج شعبہ انگریزی کے ہیڈ اور پروفیسر کی جگہ پیش کی جسے میں نے نہایت مضحکہ خیز عجلت سے اسی دم قبول کرلیا۔''(21)

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اورنگ آباد دکن کی ملازمت نے انہیں موقع دیا کہ وہ یہاں کی ٹوپوگرافی کا مطالعہ کرتے رہیں۔ چنانچہ ان کا جملہ ہے کہ اورنگ آباد دکن سے مجھے آسمان، چاند، تارے اور سورج اپنے قریب ہی معلوم ہونے لگے جن سے مجھے ان نئی دنیاؤں تک اپنی رسائی قابل قیاس لگنے لگی۔ دراصل یہ ایک تخلیقی ذہن کی فکر ہے جو ایک جگہ کے حوالے سے سامنے آتی۔ نیروبی جانے کے بعد بھی وہ دلی اور اس کے نواح کو نہ بھولے۔ دراصل جوگندر پال کے یہاں پاکستان اور ہندستان کی وہ تمام جگہیں جہاں سے ان کا کچھ بھی تعلق رہا ہے بیحد عزیز ہیں اور ان کی یادوں کے نہاں خانے میں رچے بسے ہیں۔

جوگندر پال اردو کے ایک معتبر فکشن لکھنے والے ہیں جن کی پہلی تحریر ''تعبیر'' ہے جو ۱۹۵۴ء میں مرے کالج، سیالکوٹ میں شائع ہوئی اور پہلی باضابطہ کہانی ''تیاگ سے پہلے'' ۱۹۴۵ء میں ماہنامہ ''ساقی'' دہلی میں شائع ہوئی۔ تب سے اب تک ان کے کتنے افسانوی مجموعے، ناول اور ناولٹ شائع ہو چکے ہیں۔ نامکمل لیکن ایک فہرست یہاں درج کی جاتی ہے:

افسانوی مجموعے: ''دھرتی کالال''(۱۹۶۱ء)،''میں کیوں سوچوں'' (۱۹۶۲ء) ''رسائی'' (۱۹۶۹)''مٹی کا ادراک'' (۱۹۷۰ء)،''لیکن''(۱۹۷۷ء) ،''بے محاورہ'' (۱۹۷۸ء) ،''بے ارادہ''(۱۹۸۱ء) ''کھلا''(۱۹۸۹ء)،''کھودو بابا کا مقبرہ'' (۱۹۹۴ء)،''جوگندر پال کے منتخب افسانے''(۱۹۸۷ء)''جوگندر پال کے افسانوں کا انتخاب''(۱۹۹۶ء)''سلوٹیں''۱۹۷۵ء)،''کتھانگر''(۱۹۸۶ء)۔

ناول:۔''ایک بوند لہو کی''(۱۹۶۲ء)''نادید''(۱۹۸۳ء)،''خواب رو''(۱۹۹۱ء)

ناولٹ:''بیانات''(۱۹۷۵ء)''آمد و رفت''(۱۹۷۵ء)۔

ان کا انتقال ۲۰۱۶ء میں حیدرآباد بھارت میں ہوا۔

جوگندر پال اپنی افسانہ نگاری کے سلسلے میں ایک سوال کرتے ہیں ''میں کیوں لکھتا ہوں؟'' اور پھر جواب دیتے ہیں کہ:

> ''زندگی کے شعور وادراک کا اظہار ایک فطری عمل ہے ۔ اگر میں لکھ کر یہ اظہار نہ کروں گا تو اپنی فطرت کے مطابق کوئی اور ذریعہ اظہار کرلوں گا.................. ہر وہ ذی شعور انسان فنکار ہے جو کسی نہ کسی طرح اپنے شعور کے فنکارانہ اظہار کے لئے بے چین رہتا ہے......
>
> ....افسانہ نگاروں کا یہ بھی کمال ہے اپنے سفر کے دوران کسی گھٹا ٹوپ اور دشوار گزار جنگل سے سیٹیاں بجاتا ہوا گزر جائے اور اس کے پیچھے پیچھے اوروں کے آنے کے لئے ایک شاہراہ بنتی جائے ۔ اس کا یہ ایک اہم کنٹر بیوشن ہے کہ اس کی بے باکی فکر کی بدولت متمدن زندگی کے نقشہ کا کینوس اور پھیل جاتا ہے اور سچائیوں کی مزید سچائی واہوتی ہوئی نظر آنے لگتی ہے اور انسانی نسل اپنے علم وفکر سے بور نہیں ہوتی............''(22)

اپنی افسانہ نگاری کے باب میں جوگندر پال کی یہ وضاحت بیحد اہم ہے اوران کے فکر وفن کی تفہیم میں بیحد معاون بھی۔اس سلسلے میں ان کا ایک کلیدی بیان قابل توجہ ہے:

''میرے ان گنت ذاتی نظریات ہیں...... تاہم میرا ادبی نظریہ ایک بھی نہیں۔ادبی نظریوں سے ادیب تعصّبات کا شکار ہوجاتا ہے۔کسی زندہ افسانے میں نظریئے افسانہ نگار کے نہیں اس کے کرداروں کے ہوتے ہیں..........''(23)

جوگندر پال کے افسانوں میں زندگی کے مسائل تو ہیں ہی لیکن ان کے کسی ایک افسانے میں زندگی کا کوئی ایک ہی مسئلہ نہیں ہوتا۔ایک ہی افسانے میں متعدد مسائل ایک دوسرے سے دست وگریباں رہتے ہیں۔ پال ان میں کسی ایک پر یا ایک سے زیادہ پر اچٹتی نظر ڈالتے ہیں، کسی پر تفصیلی، کہیں محض اشارے۔ جوگندر پال کی سادری فکری قوت ان کے افسانے میں مبدل ہوگئی ہے۔اس کے لئے کومل، نازک، دھیما دھیما اورشیریں انداز بیان ان کے افسانوں کے خصائص ہیں۔ان کے کردار ثقافتی، تمدنی، معاشرتی، معاشی اورفلسفیانہ امور پر اپنی واضح رائے رکھتے ہیں اوران کے اظہار کا موقع تلاش کرتے رہتے ہیں۔لہٰذا اظہار آرا کا انداز ہر جگہ پایا جاتا ہے۔ وہ اس کا التزام نہیں کرتے کہ کرداروں کی سطحیں متعین کریں اور پھران کے مطابق وہ ان سے گفتگو کروائیں۔ دراصل ان کے تمام افسانوں میں ایک ہی کردار ہے اور وہ یہ ہے آج کا بہت ذی علم، ٹوٹا ہوا، شکی، چالاک، عیار، تنہا آدمی جو اپنی نظر پوری کائنات پر بھی رکھنا چاہتا ہے اوراپنی ذات پر سے ہٹانا بھی نہیں چاہتا۔لہٰذا گفتگو کا انداز ایک ہے اور یہ بہرحال شیریں اور نازک نہیں بلکہ تندوتیز ہے اورطنزآمیز ہے۔

وہاں اشرفی نے اپنی کتاب تاریخ ادب اردو(جلدسوم) میں جوگندر پال کے افسانوں پر یوں رقم طراز ہیں:

'' مجھے احساس ہے کہ وہ حضرات جو افسانے کو کومل، نازک، سیدھا سپاٹ فن سمجھتے آئے ہیں انہیں جوگندر پال کو پڑھ کر سخت مایوسی ہوگئی لیکن جنہیں افسانے کے ارتقائی سفر کی خبر ہوگی اوراس کے اعلیٰ منصب کا

احساس ہوگا وہ بار بار اس طرف رجوع کریں گے۔'' (24)

جوگندر پال کے ناول اور ناولٹ نگار کی حیثیت بھی قابل لحاظ ہے۔ ان کے ناول ''بیانات''، ''خواب رو''، ''نادید'' وغیرہ پر خاص توجہ کی گئی ہے۔ ''خواب رو'' اور ''نادید'' کے بارے میں وزیر آغا یوں رقم طراز ہیں:

''اس ناول کا عنوان 'خواب رو' بجائے خود اس بات کی طرف ایک بلیغ اشارہ ہے کہ اصل چیز خواب اوراس کی روانی ہے ۔۔۔۔۔ ''نادید'' اندھوں کے گھر کی ایک کہانی ہے مگر اس میں کئی معنوی سطحیں مضمر ہیں۔ اہم ترین سطح عوام اورعوامی لیڈر کے فرق کی نشاندہی کرتی ہے۔ عوام بظاہر اندھے لوگ ہیں۔ معصوم، بے ریا، ۔۔۔۔ لہٰذا انسانی سطح پر انہیں اندھا ہی قرار دینا ہوگا۔ یوں دیکھیں تو ایک سیاسی ناول نہ ہوتے ہوئے بھی اس ناول میں سیاست کو ایک ایسے نئے زاویئے سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس کے بارے داغ دھبے عریاں ہوکر سامنے آگئے ہیں۔'' (25)

ویسے وزیر آغا کے علاوہ ''نادید'' کا تجزیہ کرنے والوں میں انور سدید، عتیق اللہ، حیدر قریشی، پیغام آفاقی، ممتاز احمد اور حمید سہروردی بھی ہیں۔ ان تمام لوگوں نے ''نادید'' کی اہمیت کا بطور خاص اظہار کیا ہے۔ لطف الرحمٰن نے ''بیانات'' کے تجزیے میں اس کی فلسفیانہ بصیرت، عصری حسیت اور ظاہری معنویت پر خاصا زور صرف کیا ہے اور اختتام پر لکھتے ہیں:

''وجودیت کی قدروں پر مشتمل اس سے زیادہ بھرپور، مکمل، متحرک اور مختلف عصری حسیات وکیفیات کا ناول میری نگاہ سے نہیں گزرا۔'' (26)

غرضکہ ایک افسانہ نگار اور ناول نگار کی حیثیت سے جوگندر پال کی اپنی شناحت ہے اور یہ شناخت امتیازی

بھی ہے۔

قدرت اللہ شہاب (1917-1986ء) تک: پاکستان کے نامور اردو ادیب اور بیورو کریٹ تھے۔ ان کی پیدائش فروری 1917ء گلگت موجودہ آزاد کشمیر میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم انہوں نے ریاست جموں و کشمیر اور موضوع چمکور صاحب ضلع انبالہ میں حاصل کی۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم۔ اے انگلش کیا۔ ۱۹۴۱ء میں انڈین سول سروس میں شامل ہوئے۔ ابتداء میں شہاب صاحب نے بہار اور اڑیسہ میں خدمات سرانجام دیں۔ ۱۹۴۳ء میں بنگال میں متعین ہوگئے۔ آزادی کے بعد حکومت آزاد کشمیر کے سیکریٹری جنرل ہوئے۔ بعدازاں پہلے گورنر جنرل پاکستان غلام محمد، پھر اسکندر مرزا اور بعدازاں صدر ایوب خان کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ پاکستان میں جنرل یحییٰ خان کے برسر اقتدار آنے کے بعد انہوں نے سول سروس سے استعفیٰ دے دیا اور اقوام متحدہ کے ادارے یونیسکو سے وابستہ ہوگئے۔ انہوں نے مقبوضہ عرب علاقوں میں اسرائیل کی شرانگیزیوں کا جائزہ لینے کے لئے ان علاقوں کا خفیہ دورہ کیا اور اسرائیل کی زیادتیوں کا پردہ چاک کیا۔ ان کی اس خدمت کی بدولت مقبوضہ عرب علاقوں میں یونیسکو کا منظور شدہ نصاب رائج ہوگیا جو ان کی فلسطینی مسلمانوں کے لئے ایک عظیم خدمت تھی پاکستان رائٹرز گلڈ کی تشکیل انہی کی مساعی سے عمل میں آئی۔ صدر یحییٰ خان کے دور میں وہ ابتلا کا شکار بھی ہوئے اور یہ عرصہ انہوں نے انگلستان کے نواحی علاقوں میں گزارا۔ شہاب صاحب ایک بہت عمدہ نثر نگار اور ادیب بھی تھے۔ ان کی تصانیف میں یا خدا، نفسانے، ماں جی اور ان کی خودنوشتہ سوانح حیات ''شہاب نامہ'' قابل ذکر ہیں۔ قدرت اللہ شہاب نے ۲۴/جولائی ۱۹۸۶ء کو اسلام آباد میں وفات پائی اور اسلام آباد کے سیکٹر H-8 کے قبرستان میں سپرد خاک ہوئے۔

تصانیف:

۱۔ شہاب نامہ خودنوشت سوانح حیات

۲۔ یا خدا

۳۔ نفسانے

۴۔ ماں جی

۵۔سرخ فیتہ

شاعری میں انہوں نے رونق اور بعد میں جعفر تخلص اختیار کیا تھا۔ان کے والد مہتر چترال کے دربار میں ایک اچھے عہدے پر فائز تھے ۔عہد طفلی یہیں گذرا ۔مہاراجہ ہری سنگھ نے ان کی تعلیم کے لئے وظیفہ جاری کیا ۔ قدرت اللہ شہاب گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم ۔اے ہوئے حصول تعلیم کے بعد سول سروس میں آ گئے ۔مختلف اضلاع میں ڈپٹی کمشنر وغیرہ رہے ۔ پاکستان بننے کے بعد وہ وہاں اہم عہدے پر فائز رہے ۔غلام محمد،سکندر مرزا اور ایوب خان کے پرائیویٹ سکریٹری بھی رہے ۔موصوف پاکستان کے سکریٹری اطلاعات بھی رہے تھے ۔ جب وہ سکریٹری تھے تبھی سبکدوش ہو گئے ۔

قدرت اللہ شہاب ایک ممتاز افسانہ نگار،اہم ادیب اور قابل لحاظ شاعر تھے ۔

موصوف کی ادبی رہنمائی میں مولانا صلاح الدین احمد کا بڑا رول رہا ہے انہوں نے اپنے رسالہ ''ادبی دنیا'' میں ان کا تعارف کرایا۔ان کا پہلا افسانہ ''چکے چکے آدم'' یہیں شائع ہوا۔اسی زمانہ میں ''ادبی دنیا'' میں کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی جیسے ممتاز افسانہ نگار شائع ہو رہے تھے ۔مولانا نے ان کے ساتھ ساتھ قدرت اللہ شہاب کو بھی بڑی اہمیت دی۔ان کے پہلے افسانے کی اشاعت پر رائے دی کہ ایک نئے شہاب ثاقب کے طلوع کی نوید ہے۔

قدرت اللہ کے افسانوں کی ٹوپوگرافی کشمیر اور وہاں کا ماحول رہا ہے ۔اس موضوع پر دوسرے لوگ بھی لکھ رہے تھے لیکن قدرت اللہ شہاب کا ایک خاص انداز تھا ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے افسانوں میں کردار اور واقعات کو ایک دوسرے میں ضم کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے لہٰذا ان کی امتیازی خصوصیت واقعات اور کردار کو ہم رشتہ کرنے کی ہے ۔جس کی طرف اکثر نقادوں کی توجہ ہوئی ہے ۔اس سلسلے کا افسانہ ''پھوڑے دال ٹنگ'' کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے افسانے بھی ان کے اسی فنی کیفیت کا پتہ دیتے ہیں۔ جیسے این ڈسپش،شلوار اور جسونت سنگھ وغیرہ

موصوف کا ایک افسانہ ''دورنگا'' اپنے زمانے میں بہت مشہور ہوا۔اس افسانے کے بارے میں انور سدید

کی رائے ہے۔

> ''نام ضمیر ''پیشہ انجینئر'' لیکن عرفاً اسے دور نگا کہتے تھے۔ اس نام سے اس کو چڑ تھی لیکن یہ اس کے بس کا روگ نہ تھا۔ اس کے چہرے پر برص کے بڑے بڑے دھبے تھے، گالوں پر، ماتھے پر، ہونٹوں پر کانوں کے پاس، تھوڑی کے نیچے گردن کے اردگرد، آنکھوں سے پپوٹوں پر ہر جگہ سفیدی کے بڑے بڑے چوڑے داغ تھے۔ جن کے درمیان جا بجا اصل جلد کے کالے کالے نشان بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے جیسے سمندر سے جھاگ پر کوئلوں کے ذرے تیر رہے ہوں۔ کچھ لوگ اسے دھوپ چھاؤں کہتے تھے، لیکن یہ نام اس کے دفتر کے کلرکوں اور چپراسیوں تک ہی محدود تھا۔ کیونکہ وہ اس کے مزاج میں دھوپ کی تیزی اور دسمبر کی کپکپا دینے والی چھاؤں سے کافی واقف تھے۔ دررونگی جلد، دور نگا مزاج قسمت بھی اس کی زندگی کے ہر پہلو کو دوغلا بنانے میں مدد دے رہی تھی۔''(27)

دراصل یہاں دور نگا دروں بینی انسان کی طرف ایک جست لگا تا ہے جہاں زندگی بیمار نظر آتی ہے اور ایسی حالت میں ایک فکری لکیر ابھرتی ہے جس میں زندگی کی تلخی ہوتی ہے۔ ویسے قدرت اللہ شہاب کے کئی افسانے متاثر کرتے ہیں۔ مثلاً ''اور ''عاشہ آگی تلاش، پری محل ۱۸ سول لائنس، لیکن ''دورانگا'' کے بعد جس افسانے کی اہمیت تسلیم کی جاتی ہے وہ ''ماں جی'' ہے۔ یہ ان کے آخری دور کا افسانہ ہے۔ اس میں محبت پھوٹ پھوٹ کر بہتی ہوئی نظر آتی ہے اس لحاظ سے زندگی کی مثبت قدریں اس میں سمٹی ہوئی ہیں۔

قدرت اللہ شہاب کا ناولٹ ''یا خدا'' ہر چند کے متنازعہ رہا ہے اور اس کی فنی خامیوں پر بھی نگاہ ڈالی جاتی ہے لیکن اپنے اثرات کے لحاظ میں اسے کامیاب تخلیق سمجھتا ہوں ہر چند کر اسے فکری اعتبار سے وہ اہمیت حاصل نہیں

ہے جو دوسری تخلیقات کا مقدر رہا ہے، لیکن یہ تقسیم کے فوراً کی تخلیق ہے لہٰذا اس میں مصنف کی جذباتیت بھی ہے یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ شہاب ترقی پسندی کے خلاف رہے ہیں اوران کا تعلق حلقہ ارباب ذوق کے لکھنے والوں کے ساتھ ہوسکتا ہے لہٰذا اگر ان کی تخلیق میں ادبیت تلاش کی جاتی ہے تو وہ غلط نہیں۔

قدرت اللہ شہاب کی خودنوشت 'شہاب نامہٗ بے حد معروف ہے لیکن یہ موصوف کے انتقال کے بعد شائع ہوئی۔اس کی اہمیت اس لئے بھی ہے کہ اس میں پاکستان کے سلسلے میں کئی اہم باتیں سامنے آئی ہیں جن میں سنسنی خیزی بھی ہے۔اس لئے پاکستان میں یہ کتاب متنازعہ فیہ رہی ہے۔اس سلسلے میں سلیم اختر کی رائے ملاحظہ ہو۔

> ''قدرت اللہ شہاب کے انتقال کے بعد''شہاب نامہ چھپی تو بے حد سنسنی خیز ثابت ہوئی۔ وجہ؟ فکشن جیسا بیانیہ اسلوب اوراس پہ مستزاد اورتاریخ پاکستان کے بعض اہم ادارے کے بارے میں بعض ایسے بیانات جن کے بارے میں ہنوز سوالیہ نشانات ہیں؟ بہرحال نزاعات کی گردچھٹ جانے کے بعد''شہاب نامہ''اب آخر میں درج وظیفوں اوراوراد کی وجہ سے خوب بک رہی ہے۔''(28)

اسلم فرخی 1923ء سے 2016ء تک

ہجرت کا ذاتی تجربہ رکھنے والے انتظار حسین کا ایک اور ہم عصر سے ۱۹۱۶ء تک

اسلام فرخی کی پیدائش ۲۳ر اکتوبر ۱۹۲۳ء کو لکھنؤ میں ہوئی۔ والدہ کا گھرانہ اشاعتی کاموں سے وابستہ رہا تھا ۔ ابتدائی تعلیم تو لکھنؤ ہی میں ہوئی پھر تقسیم ہند کے بعد وہ پاکستان چلے گئے اور بقیہ تعلیم وہیں حاصل کی ۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد درس وتدریس سے منسلک ہوئے ۔ سندھ کالج کراچی میں استاد مقرر ہوئے ۔ اس کے بعد سنٹرل گورنمنٹ کالج اور کراچی یونیورسٹی میں اردو کے باوقار استاد رہے ۔ یونیورسٹی کا ایک ادارہ تصنیف وتالیف سے تعلق رکھتا تھا وہاں ان کی حیثیت ناظم کی رہی اور اس ضمن میں قابل لحاظ خدمات انجام دیں۔ پھر اسی ادارے کے رجسٹرار بھی ہوئے ۔

ڈاکٹر اسلم فرخی سب سے پہلے شاعری کی طرف متوجہ ہوئے ۔ نظمیں بھی کہیں اور غزلیں بھی ۔ اس دوران تعلیم بھی مکمل کرتے رہے ۔ پھر یہ بھی ہوا کہ وہ ایسے مشغلے کے ساتھ ریڈیو پاکستان کراچی میں مختلف حیثیتوں سے وابستہ رہے ان کے ریڈیو کے فیچر اور ڈرامے کافی مقبول ہوئے ۔

ڈاکٹر اسلم فرخی کا ایک شغف بچوں کا ادب بھی رہا ہے اور اس صنف میں انہوں نے کافی اہم خدمات انجام دی ہیں ۔ اسلم فرخی یوں تو ایک شاعر بھی ہیں لیکن ان کی نگاہ میں ان کی شاعری باعث افتخار نہیں ہے چونکہ انہوں نے نہایت معیاری خاکے لکھے ہیں اس لئے خاکہ نگاری کو اپنی شناخت کا باعث سمجھتے ہیں ۔

ڈاکٹر اسلم فرخی کی ایک جہت مذہبی اور دینی امور سے بھی وابستہ ہے ۔ وہ حضرت نظام الدین اولیاء سے بیحد عقیدت رکھتے ہیں ۔ انہوں نے اس ذات بابرکات پر مسلسل لکھا ہے ۔ ۶ عدد کتابیں اس سلسلے کی ہیں ۔

موصوف کی ادبی کارگزاری بھی بیحد اہم سمجھی جاتی ہے۔''محمد حسین آزاد: حیات وتصانیف'' ان کی ایک ایسی کتاب ہے جس پر توجہ کی جاتی رہی ہے۔انہوں نے''تذکرہ گلشن بہار'' کی تدوین بھی کی۔محمد حسین آزاد کی ''نیرنگ خیال'' پر بھی ایک کتاب قلمبند کی۔بچوں کے لئے امیرخسرو کے حوالے سے ایک معیاری کتاب لکھی ہے۔ ایک اور کتاب''بچوں کے سلطان جی''اہم سمجھی جاتی ہے۔آزاد کی درسی کتابوں پر بھی توجہ کی۔ان کے خاکوں میں''گلدستہ احباب'' نیز''آنگن میں ستارے'' معروف کتابیں ہیں۔دراصل ان کے خاکوں میں ان کے فکروفن کا پوراشعور جھلکتا ہے۔انہوں نے ضمیر نیازی اورفہیم اعظمی پر بھی خاکے لکھے ہیں،جن کی نہایت پذیرائی کی گئی ہے۔

ڈاکٹر اسلم فرخی یوں تو پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر ہیں لیکن ادبی وراثت جس طرح ان کے حصے میں آئی وہ انہیں کچھ اور بھی منصب عطا کرگئی۔

اسلم فرخی کی ایک حیثیت افسانہ نگار کی بھی ہے۔ان کے افسانے معتبر رسالوں میں چھپتے رہے ہیں۔ایک رسالہ''دنیازاد'' بھی نکالتے ہیں۔ان کا اشاعتی ادارہ''شہرزاد'' ہے جو ادبی کتابوں کی اشاعت کے لئے معروف ہے۔اسلم فرخی کے اپنے امتیازات ہیں۔ان کی کئی ادبی جہتیں ہیں،جن پر وقتاً فوقتاً نگاہ ڈالی جاتی رہی ہے۔موصوف کا انتقال ۱۵رجون ۲۰۱۶ءکو کراچی (پاکستان) میں ہوا۔

مختصر یہ کہ اس باب میں انتظار حسین کے ان نمائندہ معاصرین کا عمومی جائزہ پیش کیا گیا ہیں۔جو تقسیم ہند کے بعد ہونے والی ہجرت کا ذاتی تجربہ رکھتے ہیں۔

حوالہ جات

ا۔ تاریخ زبان اردو/جلد سوم، وہاب اشرفی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2007، ص1197

2۔ اُردو ناول آزادی کے بعد،ڈاکٹر اسلم آزاد،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی،2020،ص223

3۔ ایضاً،ص224

4۔ تاریخ ادب اُردو/ جلدسوم،وہاب اشرفی،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی2007،ص1197

5۔ ایضاً،ص1198

6۔ اُردو ناول آزادی کے بعد/ ڈاکٹر اسلم آزاد،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی،2020ء،ص322

7۔ ایضاً،ص323

8۔ ایضاً،ص323

9۔ تاریخ ادب اُردو/ جلدسوم،وہاب اشرفی،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی2009،ص1225

10۔ اُردو ناول آزادی کے بعد/ ڈاکٹر اسلم آزاد،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی،2009ء،ص242

11۔ ایضاً،ص242

12۔ خدیجہ مستور بحیثیت ناول نگار،ممتاز حسین، دریا گنج دہلی،1988،ص4,5

13۔ تاریخ ادب اُردو/ جلدسوم،وہاب اشرفی،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی2007،ص1233

14۔ اُردو ناول آزادی کے،اسلم آزاد ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی،2020ء،ص308

15۔ ناول ''اورانسان مرگیا'' رامانندساگر،نوہند پبلشرز لمیٹڈ،بمبئی 1948،ص45.46
16۔ اردو ناول آزادی کے بعد۔ ڈاکٹر اسلام آزاد، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤ ، دہلی 2020 ص،136-137
17۔ ایضاً،ص137
18۔ اردوادب کی مختصرترین تاریخ آغاز سے 2000ءتک/ ڈاکٹرسلیم اختر (ص532,533)
19۔ ایضاً،ص1199
20۔ ایضاً،ص1200
21۔ جوگندر پال ، ذکر،فکر،فن ،مرتب پروفیسر ارتضٰی کریم،موڈرن پبلشنگ ہاؤس دہلی،1999، ص53)
22۔ تاریخ ادب اردو، جلدسوم، وہاب اشریف، پروفیسرارتضٰی کریم، دہلی،1999،ص1220
23۔ ایضاً،ص1220ء
24۔ ایضاً،ص1222
25۔ جوگندر پال، ذکر،فکر،فن، مرتب ڈاکٹر ارتضٰی کریم ، موڈرن پبلشنگ ہاؤس،دہلی،1999، ص448
26۔ ایضاً،ص473
27۔ تاریخ ادب اُردوجلدسوم۔ وہاب اشرفی، دہلی 2007ء،ص1189
28۔ اردوادب کی مختصرترین تاریخ آغاز سے 2000 تک،ڈاکٹرسلیم اختر، ایس ایچ آفسٹ پرنٹرس دہلی،2013،ص532-533

﴿ باب سوم ﴾

انتظار حسین کے ناولوں میں تقسیم ہند کے اثرات اور ہجرت کا کرب

(الف)　ناول　چاند گہن 1953ء کے حوالے سے

(ب)　ناول　بستی 1980ء کے حوالے سے

(ج)　ناول　تذکرہ 1987ء کے حوالے سے

(د)　ناول　آگے سمندر ہے 1995/96 کے حوالے سے

برصغیر ہندستان کی آزادی لاکھوں افراد کے لئے حیاتِ نو کا پیغام لے کر آئی لیکن ملک کو تقسیم کے جس عمل جرّاحی سے گزرنا پڑا اس کی ہولنا کی دیر تک باقی رہی۔ نو آزاد ممالک ہندستان اور پاکستان کے لاکھوں لاکھ افراد کو سنگین مصائب و آلام برداشت کرنا پڑے۔ چنانچہ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۰ء تک کے وقفے میں جو شاعری، جو افسانے اور جو ناول منظرِ عام پر آئے۔ کم وبیش ان سب پر فسادات کے اثرات ہیں۔ اس طرح کے ادبی نمونوں کا ایک بڑا ذخیرہ ہو گیا جسے اب ہم ''فساداتی ادب'' کہتے ہیں۔ فسادات سے وابستہ نظموں اور افسانوں ہی کی طرح ناولوں میں بھی بالعموم فسادات کے ہنگاموں کے نقشے پیش کئے گئے۔ انسان نے جی بھر کر انسان کا خون پیا تھا، اس کا جسم نوچا تھا اور اس کی گردنیں کاٹی تھیں۔ انسان کی اس درندگی، وحشت، بربریت اور بہیمت کو تاثراتی رنگ میں ناولوں کے ذریعے بھی پیش کیا گیا۔ دورِ حاضر کی زندگی کے تضادات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر اسلم آزاد نے ہرسٹلی کا ایک قول نقل کیا کہ

> ''ہمارا یہ دور شدید مایوسی اور تضاد کا دور ہے۔ اس میں انسان کہتا ایک ہے اور کرتا ایک ہے۔''[۱]

جہاں تک انتظار حسین کی تخلیقات کے مطالعے، ان کی تفہیم اور ان کے تجزیہ وتنقید کا تعلق ہے اس کے لئے تاریخ سے واقفیت لازمی شرط ہے۔ یہ واقفیت محض اس نوعیت کی نہ ہو کہ فلاں واقعے، تجربے یا سانحے کے رونما ہونے کے کیا علل واسباب تھے، یا یہ کہ ان کی جزئیات کیا تھیں، یا پھر یہ کہ ان کے کیا نتائج نکلے۔

ادب سے ہمارا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی تاریخی واقعے کو محض اطلاع کے انداز میں پیش نہیں کردے بلکہ اس عہد کے انسانوں کے جذبات واحساسات، افکار وخیالات کو اس فنی چابکدستی سے پیش کرے کہ اس عہد کے انسان صرف مٹی کے پتلے نہیں رہیں بلکہ ہمارے سامنے اس زمانے کا معاشرہ اپنی تمام تر نیرنگیوں کے ساتھ جی اٹھے۔ سماجی تضادات، عقائد وتوہمارت، رسم ورواج، تہذیب وثقافت کے ساتھ ساتھ اس وقت کے فکری رویے، ذہنی رجحانات، جذباتی ہلچل، سب عیاں ہو جائیں۔ مہاتما بدھ کپل وستو میں پیدا ہوئے، ستیہ کی تلاش میں گھر بار چھوڑا، در بدر گھومے اور آخر کار نروان حاصل کیا۔ یہ تاریخ مہاتما بدھ نے حق کی تلاش میں کیا کیا دکھ اٹھائے، کن کن موہ

سے اپنے کو بچایا۔ اس کے لئے انہیں خود اپنے آپ سے کتنی جنگیں کرنی پڑیں، اپنے نفس پر قابو پانے کے لئے کیا کیا جتن کرنے پڑے، جذبات وخیالات کے کن کن دشوار مراحل سے گزرنا پڑا، یہ ادب ہے۔

جس طرح کی تاریخ درسی کتابوں یا دیگر ذرائع سے ہم تک پہنچتی ہے وہ دراصل کسی خاص عہد کی سیاسی تاریخ ہوتی ہے جو اپنے عہد کی سماجی زندگی، اس کے مزاج اور انسانی نفسیات کا بھرپور احاطہ کرنے میں ناکام رہتی ہے۔ دن بہ دن یہ بات واضح ہوتی جارہی ہے کہ کسی عہد کی سیاسی تاریخ کے حوالے سے اخذ کیے گئے نتائج متعلقہ معاشرے کے لئے مصیبت وابتلا کا سبب بن جاتے ہیں۔ تاریخ کے غلط، گمراہ کن یا جزوی تجزیے سے حال کا معاشرہ مختلف النوع تعصّبات کا شکار ہوجاتا ہے اور ان تعصّبات کا اظہار۔ علی الاعلان ہو یا دبے چھپے انداز میں۔ ارتقا کے عمل کو سست کردیتا ہے کور انسانی رشتوں اور تعلقات میں رخنے ڈالتا ہے۔ بعض اوقات جب یہ تعصّبات شدت اختیار کرجاتے ہیں تو قومیں اور جماعتیں ماضی کو دہرانے کے درپے ہوجاتی ہیں۔ یہ رویہ طرح طرح کے فسادوں کو جنم دیتا ہے۔ جہاں ایک طرف یہ تعصّبات کو جائز ٹھہراتا ہے وہیں دوسری طرف انسانی تہذیب کے فطری ارتقا کے عمل کی نفی کرتا ہے۔ محمد عمر میمن کو دیئے گئے ایک انٹرویو میں انتظار حسین نے اس جانب یوں اشارہ کیا ہے:

> ''یہ حادثہ ہمارے یہاں مستقل چل رہا ہے، صرف سرسید تحریک کے بارے میں ہی نہیں کہ ہم واقعات کو تاریخ سے الگ کر کے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً میں سنتا ہوں کہ صاحب ہمیں خلافت راشدہ کی تجدید کرنی چاہیئے اور پونے چودہ سو سال کی پوری تاریخ کو غائب کرجاتے ہیں تو یہ تاریخ سے Isolate کرکے، تاریخ سے الگ کر کے، یہ واقعے اور افعال کو سمجھنے کی جو کوشش ہے، یہ بھی میرے خیال میں ہماری ابتلا کا باعث ہے۔''(۲)

لہٰذا انتظار حسین کی تخلیقات کی صحیح تفہیم وتنقید کے لئے تاریخی شعور وآگہی انتہائی ضروری ہے۔ تاریخی شعور سے مراد تاریخ کے عرفان اور اس کی آگہی سے ہے۔ یعنی کسی خاص دور کے افراد وخاندان اور ان کے اقدار وافکار

واحساسات کوان کے مکمل تناظر میں سمجھنا۔ان کرداروں اور رویوں کی سائیگی اور جبلتوں سے واقفیت جو کسی واقعے کے معمار تھے یا براہ راست یا بالواسطہ طور پر اس کے ذمہ دار تھے۔تاریخ سے ہماری ایسی واقفیت ماضی سے متعلق ہمارے فیصلوں میں اعتدال کوراہ دیتی ہے اور ماضی کی تنقید وتجزیے میں غلطی کے امکانات کوکم کرتی ہے۔

ایسا ہی ایک تاریخی واقعہ 1947ء میں وقوع پذیر ہوا جب آزاد ہونے کے ساتھ ساتھ ہندستان دوحصوں میں تقسیم بھی ہوگیا۔تقسیمِ ہند کے نتیجے میں بہت سے افراد اپنے جدی پشتینی علاقے کو چھوڑ کر دوسرے علاقوں میں جا بسے یا اس کے لئے مجبور کر دیئے گئے ۔تاریخ کے جزوی مطالعے اور تجزیے نے اس پورے سانحہ کا ذمہ دار انگریزوں کوٹھہرایا، یا پھر مسلمانوں کو، یا ہندوؤں کو، یا پھر''دوقومی نظریے'' کواوراس سے جونتائج برآمد کیے گئے اس نے ہندستان اور پاکستان، دونوں ملکوں میں نفرت اور تنگ نظری کوفروغ دیا۔اور جب اس بحران کے لئے ذمہ دارا افراد، طبقے اورفرقے کی نشاندہی کردی گئی تو پھرانہیں ان کے کیے کی سزا بھی تو ملنی چاہئے تھی اور یہ سزائیں کون دے گا؟ ظاہرسی بات ہے کہ سماج کا مقتدر طبقہ!انتظارحسین الزام تراشی سے اپنا دامن بچانے کی کوشش کرتے ہیں اور ہجرت اوراس سے پیدا شدہ کوائف ومسائل کومحدود تاریخی پس منظر میں دیکھنے سے احتراز کرتے ہیں۔محمد عمر میمن کودیئے گئے انٹرویو میں انتظارحسین فرماتے ہیں:

> ''میرے ساتھ یہ عجیب قصہ ہے کہ جب کوئی واردات گزرتی ہے،کوئی سانحہ گزرتا ہےتو میں اسے اسی عہد میں رکھ کرنہیں دیکھتا بلکہ ایک پوری پچھلی جو Psyche ہےقوم کی، پوری جوتاریخ ہےقوم کی، اس کے حوالے سے اسے سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں۔(۳)

انتظارحسین کی تخلیقات سے بحث کرتے ہوئے شمیم حنفی نے یونگ اور ایلیٹ کے حوالے سے دو بہت ہی کارآمد اقتباسات نقل کیے ہیں۔ بقول یونگ:

> اگر ہم (گزرے ہوئے) زمانوں اورانسانوں کی دانش کے آثار پرنظر ڈالیں تو پتہ چلے گا کہ وہ تمام باتیں جوآج ہمیں سب سے

زیادہ مرغوب اور ہمارے لیے سب سے قیمتی ہیں انتہائی اچھی زبان میں
اب سے پہلے کہی جا چکی ہیں۔(۴)

ایلیٹ نے کہا تھا:

''اگر ہم واقعتاً کسی دوسرے زمانے کی زندگی کے باطن میں اتر
سکیں تو ہم خود اپنے زمانے کے باطن کی تہہ تک بھی پہنچ جائیں گے۔(۵)

درج بالا اقتباسات جس اہم نکتے کی وضاحت کرتے ہیں وہ یہ کہ ماضی حال اور مستقبل زمانے کے اعتبار سے بھلے ہی اپنی جداگانہ حیثیت رکھتے ہوں لیکن انسانی ذہن وتجربات کے سفر کی رو سے باہم اس طرح پیوست ہوتے ہیں کہ انہیں الگ الگ خانوں میں رکھ کر انسانی ذہن وتجربات کو سمجھنا ناممکن ہے۔ اور چونکہ تخلیق کا تعلق ذہن اور احساس سے ہوتا ہے اس لئے تخلیق کی رو سے ان تینوں کا باہم شیر وشکر ہونا تو عین لازمی ہے۔ اس ضمن میں اقتباس اول میں انتظار حسین کا ذاتی بیان خود اس بات کی وضاحت کر دیتا ہے کہ ایسی واردات کو صرف حال کی عینک سے نہیں دیکھتے بلکہ اس کو سمجھنے کے لئے ماضی کا سفر کرتے ہیں جس کی وجہ سے اکثر انہیں رجعت پسند کے خطاب سے بھی نوازا گیا۔ قوم کے ماضی یعنی قوم کی تاریخ کا مطالعہ وہ تاریخ کی موٹی موٹی کتابوں کی ورق گردانی سے نہیں کرتے بلکہ اس کے لئے وہ اس عہد کی ادبی تخلیقات کا مطالعہ کرتے ہیں۔ وہ اپنے لئے مواد اس زمانے کے قصے کہانیوں، دیومالا، اساطیر، قصص، بزرگوں کے ملفوظات سے حاصل کرتے ہیں۔ انہیں اس بات کا یقین ہے کہ یہ ساری وارداتیں بنی نوع انسان پر اس سے قبل بھی گزر چکی ہیں اور انہیں انتہائی اچھی زبان میں اسی زمانے میں کہا بھی جا چکا ہے۔ دوسری بات وہ قوم کی Psyche کرتے ہیں۔ انہیں اس کا بھی یقین ہے کہ اگر وہ سابقہ عہدوں کی زندگی کے باطن میں اتر سکیں تو شاید وہ اپنے عہد کے باطن کی تہہ تک اتر پانے میں کامیاب ہوسکیں گے۔ بہ الفاظ دیگر ماضی اور حال سے وابستہ افراد اور قوم کی Psyche تک ان کی رسائی ہو سکے گی۔

'تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے' یہ مقولہ اتنا مشہور ہو چکا ہے اور اس کا استعمال اتنے موقعوں پر ہوتا ہے کہ بعض اوقات ہم سہل پسندی کے سبب اس فقرے کو عام سا جملہ تصور کر لیتے ہیں اور اس کی سطحی معنویت سے آگے

جانے کی کوشش نہیں کرتے۔تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے اگر سچ ہے تو یہ جاننا انتہائی اہم ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے ؟انسانی تہذیب نے بے شمار جنگیں اوراس کی تباہ کاریاں دیکھی ہیں پھر بھی آئے دن جنگیں کیوں ہوتی ہیں؟اور نہ بھی ہورہی ہوں تو ہم ہمہ وقت اس کے لئے تیار کیوں رہتے ہیں؟ یہاں یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ انسان کی سرشت میں،فطرت میں یا انتظار حسین کے لفظوں میں سائیکی میں کچھ ایسا ضرور شامل ہے جس کا بار بار اظہار ہی تاریخ کو دہرانے کا سبب بنتا ہے۔وقت اتنا طاقتور ہے کہ اس کے آگے سب مجبور محض ہیں اوراس کے جبر کے آگے انسان اپنے ان تجربوں کو بھی دہرانے پر مجبور ہوجاتا ہے جواسے ناپسند ہیں۔ہجرت بھی ایک ایسا عمل ہے جوانسان کو اپنی جڑ سے جدا کردیتا ہے،طرح طرح کے آلام ومسائب میں گرفتار کردیتا ہے، پھر بھی ہجرتیں آنے والی نسلوں کے تجربے کا حصہ بنتی رہتی ہیں۔یعنی انسان کی سائیکی تاریخی واقعے کا موجب بنتی ہےاورتاریخی واقعہ انسان کی سائیکی ترتیب دیتا ہے۔یہ دونوں جز ولاینفک ہیں اور دونوں کو الگ الگ کرکے دیکھنا گمراہ کن نتائج برآمد کرسکتا ہے۔

آیئے اب یہ دیکھا جائے کہ انتظار حسین کے یہاں 'ہجرت' کا کیا تصور ہے۔ان کے نزدیک ہجرت محض سرحد پار کر لینے کا نام نہیں ہے بلکہ ایک بستی سے دوسری بستی کی جانب ہجرت دراصل اپنی ذات کے مرکز سے ہجرت کے مترادف ہے۔مرکز سے ہجرت کے سبب ہی مہاجروں کی زندگی میں انتشاراوربے جڑی گھر کرنے لگتی ہے۔ اس کو پہیئے کی مثال کے ذریعے زیادہ بہتر طریقے سے سمجھا جاسکتا ہے۔گردش کررہے پہیئے کا ایک مرکز ہوتا ہے جہاں سکون اور قرار ہے جبکہ پہیئے کے Circumference پر گردش ہے،حرکت ہے، اور ہجرت کے عمل میں انسان اسی مرکز سے Circumference کی جانب سفر کرتا ہےاورنتیجتاً سکون وقرار سے دور ہوکر گردش،حرکت اوراضطراب کی حالت میں پہنچ جاتا ہے۔

انسانی زندگیاں ان مرکزی گریز قوتوں (زمانہ، حالت) کے جبر میں ہیں اور جس کی وجہ سے ہجرت کرتی ہیں۔ان قوتوں سے مدافعت اور محافظت کا سیلہ یادیں ہیں جوانسان کواپنے مرکز کی طرف لے جاتی ہیں اورانتشار وعدم شناخت سے بچانے کی کوشش کرتی ہیں۔ان دونوں قوتوں کی باہم کشمکش میں اکثر جبر (مرکزگریز قوت) کی بالادستی قائم ہوجاتی ہے جس کے نتیجے میں انسان دکھ اور بے چارگی میں مبتلا ہوجاتا ہے۔انتظار حسین کے فکشن میں

دکھ، بے چارگی اور انتشار کی اس کیفیت سے محافظت کا وسیلہ یادیں ہیں ۔ان حوالوں سے انتظار حسین کے یہاں ماضی کو کافی اہمیت حاصل ہے اور ماضی تک رسائی کا وسیلہ یادیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تخلیقات میں یادوں (ذاتی ،ملکی ،قومی ، اجتماعی) کی زبردست کارفرمائی نظر آتی ہے ۔ یادیں دراصل اس جبر (حالات ، زمانہ) کی نفی کی کوشش سے معنون ہیں جس کی وجہ سے ہجرت کرنی پڑی۔ گویا ایک مہاجر اپنی یادوں کے توسط سے نہ صرف اپنے حال میں ماضی کی پیوندگاری کر کے اپنی ذات کی تکمیل کی کوشش کرتا ہے بلکہ اپنے مرکز (سکون ،قرار) سے قریب تر ہو جاتا ہے ۔انتظار حسین کے نزدیک یادوں کے توسط سے ماضی کی بازیافت دراصل خود اپنی ذات اور اس کی کلیت کی بازیافت کا عمل ہے اور ان یادوں کو محض ماضی پرستی کہنا سہل پسندی ہوگی ۔

یہاں پر ان کا تذکرہ بھی خالی از دلچسپی نہیں ہوگا کہ انتظار حسین کے یہاں ہجرت کا تجربہ کن کن صوتوں میں اظہار پاتا ہے؟ ایک ہجرت تو وہ ہے جو سرحد پار کرنے کی وجہ سے وجود میں آتی ہے۔جس کے نتیجے میں انسان اپنی زمین ، اپنے بچپن اور ایک پورے تہذیبی نظام سے جدا ہو جاتا ہے ۔ہجرت کی ایک شکل ان افسانوں میں نظر آتی ہے جہاں انسان اپنے وجود کی برتر کیفیت سے کم تر صورتحال کی جانب ہجرت کرتا ہے ۔ جیسے افسانہ 'پرچھائیں'، 'ٹانگیں' وغیرہ میں ۔ہجرت کی ایک اور نوعیت انسانی سطح سے حیوانی سطح کی جانب ہجرت ہے جس کے نتیجے میں انسانی وجود سے بشریت کا اخراج ہو جاتا ہے ۔'آخری آدمی'، 'کایا کلپ' وغیرہ اسی تجربے پر مبنی افسانے ہیں ۔ایک اور صورت ترک سے دنیا کی جانب ہجرت ہے جس کی وجہ سے روحانی اور اخلاقی انحطاط جیسے مسائل پیدا ہوتے ہیں ۔ جیسے ''زرد کتا'، 'پتے' وغیرہ میں ایک اور قسم کی ہجرت انتظار حسین کی تخلیقات میں جابجا نظر آتی ہے وہ ہے ، ایک جون سے دوسرے جون میں ہجرت یعنی جنموں کا چکر ، جس پر واضح طور سے بدھ جا تک کتھاؤں کے اثرات نمایاں ہیں ۔

انتظار حسین کی تخلیقات کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ ہجرت کے لئے کسی مخصوص تاریخی واقعہ کو ہی ذمہ دار نہیں ٹھہراتے ہیں بلکہ ہجرت کی تہہ میں کارفرما اسباب کا وسیع تہذیبی پس منظر میں جائزہ لیتے ہیں اور جو نتیجہ اخذ کرتے ہیں اس سے انحراف کی زیادہ گنجائش نہیں ۔ان کے نزدیک ہجرت کی بنیادی وجہ

ظلم اور خوف ہے۔ سماج میں جب جب ظلم و بربریت تجاوز کر جائیں اور افراد و خاندان کی جان و مال اور عزت و آبرو خطرے میں پڑ جائے تو متاثرہ افراد خوف و دہشت میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور ہجرت کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں۔

> ''اور جب ہم نے تم سے یہ عہد لیا تھا کہ آپس میں خونریزی مت کرنا اور اپنوں کو اپنے ملک سے مت نکالنا۔ پھر تم نے اس کا اقرار کیا تھا اور تم اس کے گواہ ہو۔ پھر وہی تم ہو کہ اپنوں کو قتل کرتے ہو اور اپنوں میں ایک گروہ کو ملک سے نکالتے ہو۔ قتل کیا، پھر قتل ہوئے۔ نکالا، پھر نکلے، اور پھر جب دہشتیں راہوں میں خیمہ زن ہوئیں اور گلیوں کے کواڑ بند ہو گئے اور گھروں سے چکی کی آواز آنی بند ہو گئی اور چولہے ٹھنڈے ہو گئے۔''(۶)

ہجرت کے عمل میں انسان اشیا و افراد و مقامات کے ایک پورے مظہریاتی نظام سے جدا ہو کر دوسرے نظام سے وابستہ ہو جاتا ہے۔ یعنی ہجرت کے بعد اشیا، افراد و مقامات کا مربوط نظام ہجرت سے قبل کے نظام سے مختلف ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انتظار حسین کی تخلیقات میں افراد اور اشیا کا رشتہ افراد کے مابین رشتے سے زیادہ مستحکم نظر آتا ہے۔ ان کی منظر نگاری بے جان پس منظر نہیں ہے بلکہ اس پوری تہذیبی فضا کو خلق کرنے کا عمل ہے جس کے حوالے سے ان کے کرداروں کا تعین ہوتا ہے اور وہ کہانی میں ابھرتے ہیں۔ علاوہ ازیں ہجرت کے بعد تہذیبی مظاہر بھی بدل جاتے ہیں۔ اس لئے مہاجروں کو نقل مکانی کے بعد فوری طور پر اجنبیت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ اجنبیت وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کم تو ہوتی جاتی ہے لیکن مکمل طور پر کبھی ختم نہیں ہو پاتی ہے۔ ایک طویل مدت تک تو وہ اپنے کو نئے ملک میں Out Sider تصور کرتے رہتے ہیں۔

(الف) چاند گہن 1953ء کے حوالے سے

''چاند گہن'' انتظار حسین کا پہلا ناول ہے جس میں ہندستان سے ہجرت کر کے پاکستان جانے والے مہاجرین اور ان کے حالات وواقعات کو پیش کیا گیا ہے۔ اس ناول میں پیش کردہ موضوعات وہی ہیں جو انتظار حسین کے آئندہ ناولوں ''بستی'' اور'' آگے سمندر ہے''میں زیادہ فنی پختگی سے پیش کیے گئے ہیں۔ چونکہ ان موضوعات کا تفصیلی مطالعہ مذکورہ دو ناولوں کے تحت کیا جائے گا۔ اس لئے یہاں پر صرف چاند گہن کے غالب موضوع کو ہی متعارف کرانا مقصود ہے۔

مصنف نے اس ناول کا نام'' چاند گہن''اس لئے رکھا ہے کہ اس میں چاند گہن کو ایک علامت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ ناول کے ایک مرکزی کردار بوجی جو حد درجہ تو ہم پرستانہ رویہ اختیار کرتی ہے اور فطرت کے سارے مظاہر کو کسی نے کسی ابتلا سے جوڑ کر دکھاتی ہے اپنی بات کو کچھ یوں بیان کرتی ہے کہ:

> ''جب انھوں نے آسمان پہ دُم دار ستارہ دیکھا ان کے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ یہ بات ان کی اماں جان نے اپنی خالہ جی سے سُنی تھی کہ جب 1857ء میں غدر پڑا تھا تو اس سے ایک مہینہ پہلے آسمان پہ روز شام کو دُم دار ستارہ دکھائی دیتا تھا اور 1914ء کی جنگ تو خود انھیں بھی اچھی طرح یاد تھی۔ اُس زمانے میں خود اپنی آنکھ سے متواتر سات دن تک آسمان پر دُم دار ستارہ دیکھا۔''(۷)

ناول کے پہلے حصے میں ہی چاند گہن کا ذکر آیا ہے۔اور ناول کے ایک موضوع ،تو ہم پرستی کو کردار بو.جی کی زبانی منصف نے یوں بیان کیا ہیں۔

> ''بو.جی گرگٹ کو مارنا تواب سمجھتی تھی..................آندھی ان کے لئے آندھی نہیں بلکہ ستر بلاؤں کا جلوس ہوتی تھی..................گہن سورج کو لگتا یا چاند کو انھیں صدقہ دینا ضرور تھا۔صدقے کے علاوہ وہ رفع بلا کی نیت سے دو رکعت نماز بھی بجالاتی تھیں .... دعا مانگتی تھیں کہ ''الٰہی تجھے اپنے حبیب کا واسطہ چاند پہ جو وقت آن پڑا ہے۔اسے ٹال دے۔''(۸)

انتظار حسین نے بنیادی طور پر اس ناول میں اتر پردیش ہندستان کے ایک قصبے حسن پور کے لوگوں کی ہجرت کا قصہ بیان کیا ہے۔ جو اپنے آبائی قصبے حسن پور سے دہلی کے راستے سے ہوتے ہوئے نئے ملک پاکستان کے شہر لاہور، ہجرت کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ناول چاند گہن تقسیم وطن کی ٹریجڈی ہے۔ چاند گہن کا عام اور لغوی معنی تو چاند کسوف یا چاند کی روشنی کا مدہم پڑ جانا ہے لیکن اس کا تہذیبی اور تصوراتی معنی سے مراد امت مسلمہ یا مسلم قوم کا انحطاط ہے۔عبدالقادر صدیقی اپنے مضمون انتظار حسین کے ناول ''چاند گہن'' میں مسلم سماج اور اردو صحافت کا المیہ میں یوں رقم طراز ہیں کہ:

> ''یہاں چاند گہن استعارہ کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ ناول میں چاند گہن کو چار مقام پر الگ الگ کرداروں کے ذریعہ ادا کیا گیا ہے مگر خاص بات یہ ہے کہ ہر جگہ اس سے مراد مسلم قوم پر آنے والی مصیبت اور مسلم سماج کی بے حسی اور بے بسی ہے۔ اس میں صرف تقسیم وطن 1947ء کے سانحاتی چاند گہن کا ہی ذکر نہیں ہے بلکہ سانحہ کربلا کے وقت چاند گہن کا ذکر آیا ہے غدر(1857ء) کے چاند گہن کا ذکر ہے

> اور1914ء میں پہلی جنگ عظیم کے وقت ہونے والے چاند گہن(خلافت عثمانیہ کا زوال) کا بھی ذکر ہے اوراس ''چاند گہن'' کی معنویت آج بھی برقرار ہے۔آج ہندستان پاکستان، افغانستان، عراق، شام، لیبیا، یمن ہر جگہ ''چاند گہن'' ہے۔(۹)

ناول ''چاند گہن''، تقسیم وطن 1947ء کے وقت کے مسلم سماج اور مسلمانوں کی بے بسی اور بے حسی کے المیہ کو بیان کرتا ہے۔ کہانی کی شروعات لکھنو کے اطراف کے قصبہ حسن پور سے ہوتی ہے جہاں بو.جی اور ان کا بیٹا سبطین رہتا ہے۔ اگست کا مہینہ ہوتا ہے اور ملک تقسیم ہو چکا ہوتا ہے۔حسن پور کے مسلمان مستقبل کے تئیں اندیشہ ناک رہتے ہیں۔لیکن کہانی ماضی اور حال کا احاطہ کرتی رہتی ہے۔ کہانی کے مرکزی کردار دو دوست سبطین اور فیاض خان ہیں۔ دونوں گریجویٹ ہیں اور حالات حاضرہ اور ملک کی سیاسی اور ملی صورت حال پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ انھیں احساس ہوتا ہے کہ خلافت تحریک کے اختتام کے بعد مسلم قیادت فقدان کا شکار ہے۔مسلم سیاست غلط لوگوں کے ہتھے چڑھ کے غلط رخ پہ جارہی ہے اور قوم اقدام خودکشی کی طرف بڑھ رہی ہے۔ فیاض خان اور سبطین قوم کے زوال اوراس کی اصلاح پر غور وفکر کرتے ہیں اور پھر دونوں اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ قوم کے لئے کچھ کیا جائے اور ''اسلامی عوامی تحریک'' قائم کرتے ہیں لیکن دونوں کے کام کرنے کا انداز جدا ہوتا ہے یہاں سے دونوں کے راستے الگ الگ ہوجاتے ہیں سبطین، سبطین سے ڈاکٹر سبطین ہوا اور پھر پروفیسر سبطین بن گیا، کالج کے لڑکوں کی طرف سے مقبول عام سند حاصل ہوئی لیکن انھوں نے اپنی مقبولیت سے فائدہ اٹھانا نہ جانا اور پروفیسری چھوڑ چھاڑ گھر بیٹھ کر قوم کی اصلاح کے لئے ایک اخبار نکالتا ہے لیکن اخبار نہیں چل پاتا ہے پھر وہ مایوس ہوکر گھر بیٹھ جاتا ہے۔انتظار حسین کی زبانی:

> ''سبطین نے قوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور بڑے دھرلے سے ایک انگریزی اخبار نکالا، لیکن ڈاکٹر سبطین کی تیز گامی کام نہ آئی اوراخبار بلاآخر بند کرنا پڑا۔سبطین اس نتیجہ پر پہنچا کہ مسلمانوں کے متوسط

> طبقے کو گھن لگ چکا ہے۔ البتہ مسلمان عوام میں ابھی جان باقی ہے اور اگر اسلامی انقلاب کی امید کی جاسکتی ہے تو انہی عوام سے کی جاسکتی ہے۔ چنان چہ اسلامی عوامی انقلاب تحریک کی بنیاد ڈالی گئی۔ اسلامی عوامی انقلاب کے مجوزہ نقیب متوسط طبقے سے بھی بازی لے گئے ۔ چنانچہ انقلاب کو اتنی عمر بھی نصیب نہیں ہوئی جتنی انگریزی اخبار کو۔''(۱۰)

سبطین کو لگتا ہے کہ اردو صحافت میں ''الہلال''اور''ہمدرد'' نے جس طرح قوم کو جھنجھوڑا تھا اور جگایا تھا ویسے ہی اس کا اخبار بھی اثر کرے گا اور قوم اسے بھی چندہ سے نوازے گی۔ انتظار حسین چوں کہ خود بھی صحافی رہے ہیں اور اردو صحافت اور مسلم تحریکوں سے خوب خوب واقف رہے ہیں اس لئے انھیں اردو صحافت اور اردو قارئین کے رجحان کا بخوبی اندازہ رہا ہوگا جسے انھوں نے یہاں پیش کیا ہے:

> ''آخری پرچے کا ایڈیٹوریل سبطین نے بڑے ہی خضوع وخشوع سے لکھا۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے، ہاتھ کانپ رہا تھااور قلم چل رہا تھا، ایڈیٹوریل کے دوران تو نہیں لیکن اس کو پورا کر چکنے کے بعد سبطین کو ضرور خیال آیا کہ یہ ایڈیٹوریل مولانا محمد علی کا ایڈیٹوریل ثابت ہوگا۔ انقلاب کے دفتر میں چندہ یوں برسے گا جیسے کبھی ''ہمدرد'' (مولانا محمد علی کا ہفت روزہ) کے دفتر میں اس کی بارش ہوئی تھی۔''(۱۱)

سبطین کے برعکس فیاض خان دوسری راہ اختیار کرتا ہے وہ آئی سی ایس امتحان پاس کر لیتا ہے اور کلکٹر بن جاتا ہے۔ اس کے خیال میں اس سے وہ ایک تیر سے دو شکار کر پائے گا۔ اس کا خیال تھا کہ کلکٹری کی تقریب سے مسلمانوں میں بیداری پیدا کرنے کے مواقع زیادہ میسر ہوں گے۔ اس کی پہلی تقرری لکھنؤ میں ہوتی ہے لیکن وہ وہاں جانے سے صاف انکار کر دیتا ہے۔ اس کا ماننا ہوتا ہے کہ جس شہر کے جوان مثنوی ''زہرِ عشق'' پڑھ پڑھ کر زہر کھالیں اور تھیٹر دیکھنے کے لئے مشقیں بیچ ڈالے اس قوم سے کسی انقلاب کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ اسے بنگالی

مسلمانوں سے زیادہ امید ہوتی ہے اس لئے وہ اپنا تبادلہ کلکتہ کراتا ہے لیکن اسے پتہ چلتا ہے کہ ''بنگال کے مسلمان دہشت پسند مولانا محمد علی کے زمانے کے مسلمانوں کے ساتھ ہی رخصت ہو گئے۔'' اس کے بعد فیاض خان اپنا تبادلہ کلکتہ سے جنوبی ہند میں کراتا ہے اور مدراس کے علاقی موپلا کے مسلمانوں سے اسے بڑی امید ہوتی ہے وہ پورے زور شور سے اصلاح کا کام شروع کرتا ہی لیکن موپلا کے مسلمان کیا خاک سدھرتے خود اس کی کلکٹری پر بن آتی ہے اور وہ استعفادے کر سیدھا لاہور پہنچتا ہے۔ لاہور سے اسے بہت زیادہ امید ہوتی ہے اسے لگتا ہے کہ پنجابی مسلمان ایک زندہ دل قوم ہے۔ اس نے سرسید کے مایوس دل کو امیدوں کے دامن سے بھر دیا تھا۔ لاہور پہنچ کر وہ ایک پرانے اور خستہ حال کالج میں پروفیسری کر لیتا ہے اصل مقصد تو اصلاح اور بیداری ہوتی ہے لیکن پورے لاہور میں اسے سوائے مزمل (ایک طالب علم) کے کوئی دوسرا شخص نہیں ملتا ہے جو اس کا ساتھ دے سکے اور اس کے اصلاحی مشن میں ہاتھ بٹا سکے۔ وہاں سے مایوس ہو کر وہ سیدھا علی گڑھ پہنچتا ہے اور رسل گنج میں تالوں کی دکان کھولتا ہے لیکن مقصد وہاں بھی قومی اصلاح اور بیداری ہوتی ہے لیکن علی گڑھ والے باقی شہر کے مسلمانوں کے مقابلہ میں اور بھی زیادہ بے حس نکلتے ہیں۔ وہ فیاض خان کا تالا تو خوب خریدتے ہیں لیکن اُس کی اصلاحی باتوں پر مطلق دھیان نہیں دیتے ہیں۔'' اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلم متوسط طبقہ اور عام طبقہ کی صورت حال کیا تھی۔ وہ مسلم لیگ پر انحصار کر بیٹھے تھے اور کوئی دوسری آواز سننے کے متحمل نہیں تھے۔ انتظار حسین نے اس ایکٹ میں سرسید اور محمد علی کو مرکز میں رکھا ہے جو ناول کے دونوں ہیرو کے آئیڈل ہیں لیکن یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ سرسید یا محمد علی کے زمانے میں مسلمانوں کے متوسط اور عام طبقے میں اصلاح اور بیداری کے لئے جو تھوڑا بہت مادہ تھا وہ تقسیم وطن کے زمانے تک آتے آتے مفقود ہو چکا تھا۔ دینی حمیت اور قومی امداد کا جذبہ رخصت ہو چکا تھا۔ اب نہ تو لوگ اخبار پڑھنا چاہ رہے تھے اور نہ ہی کسی نئی اصلاحی تنظیم سے منسک ہونا چاہتے تھے۔ فیاض خان آخر میں اپنی امید لے کر دہلی جاتا ہے لیکن اسے وہاں بھی مایوسی ہاتھ لگتی ہے۔ ملک تقسیم ہو چکا ہوتا ہے۔ پاکستان کے شرنارتھی ہندستان آ رہے ہوتے ہیں۔ ملک کی سیاسی فضا مکدر ہو رہی ہوتی ہے لیکن دہلی کے مسلمان اپنے شب و روز میں مصروف کبوتر بازی اور نہاری میں کھانے مست رہتے ہیں۔ ناول کا مرکزی کردار فیاض خان 19/اگست 1947ء سے

21 ستمبر 1947ء تک دہلی میں تدریسی خدمات دینے کے لئے مقیم رہتا ہے ۔ اور وہ دہلی کے روزانہ کے سماجی اورسیاسی حالات کو اپنے ڈائری میں قلم بند کرتا ہے۔ وہ پوری دہلی گھوم گھوم مسلم محلوں اور مسلمانوں کے حالات کا جائزہ لیتا ہے لیکن اسے کہیں کوئی امید نظر نہیں آتی ہے ۔ اسے ایسا لگتا ہے کہ دہلی کے مسلمان اجتماعی خودکشی پر آمادہ ہیں۔ پیش ہے اس کی ڈائری کے کچھ اقتباسات:

''مسلمان محلوں کا عجب عالم ہے۔ جتنے مکان ہیں اتنے ہی کبوتر کی چھتریاں ہیں۔ جامع مسجد کے سامنے جسے دیکھو ہاتھوں میں کبوتر دبائے پھرتا ہے آگے وہ لکھتا ہے کہ میں سوچ میں پڑ گیا کہ کیا یہ وہی دلی ہے جسے شاہ جہاں نے بسایا تھا ۔ پھر دوسری جگہ وہ لکھتا ہے'' چلتے چلتے میں سوچنے لگا کہ یہ غالب کے یہاں موت کی جو اتنی شدید خواہش ملتی ہے وہ اس کی انفرادی خواہش ہے یا کسی اجتماعی خواہش کی ترجمان ہے ۔'' دہلی کے حالات دن بدن بگڑتے چلے جاتے ہیں 21 اگست کو وہ دہلی سے رخصت ہوتا ہے اور دہلی کے تعلق سے اپنی آخری رپورٹ ڈائری میں یوں قلم بند کرتا ہے۔'' بالآخر آج میں شہر سے رخصت ہو رہا ہوں ، میں نے مسلمانوں کے بہت سے شہر دیکھے بہت سی بستیوں کی سیر کی مگر اس شہر کا سفر سب سے انوکھا رہا۔ اس شہر کے درودیوار جن سے کل تک وحشت برستی تھی آج چپ چاپ حسرت کی تصویر بنے ہوئے ہیں۔''(۱۲)

انتظار حسین نے سب پلاٹ میں مسلم لیگ کے ان قائدین کی جو تقسیم کے نتیجے میں ہندستان رہ جاتے ہیں، بے چینی خوف اور پلٹی بازی کو بھی منعکس کیا ہے کہ کس طرح سے مسلم لیگی قائد حق صاحب 15 ؍اگست کے بعد سے گاندھی جی کی تعریف کرنے لگ جاتے ہیں اور ہندوؤں کے سامنے وہ دن رات ہندستان اور کانگریسی رہنما کے ساتھ اپنی محبت کی دہائی دیتے پھرتے ہیں ۔لیکن پاکستان سے آنے والے شرنارتھیوں کی وجہ سے حالات دن بہ دن

اورخراب ہوتے چلے جاتے ہیں اوراس کے ساتھ ہی حسن پور کے بھی حالات بگڑنے لگتے ہیں افواہ کا بازار گرم رہتا ہے اور ہندو مسلم تناؤ بڑھتا جاتا ہے اور بالآخران سب کو ہجرت کرنا پڑتا ہے۔انتظار حسین نے اگرچہ خود بہت بعد میں ہجرت کی ہے لیکن غالباً انھوں نے ہجرت کے مناظر دیکھے ہیں اس لئے ناول کے پلاٹ میں ہجرت کے منظر دہلی لال قلعہ سے لے کرلکھنؤ اسٹیشن اور پھرٹرین کے اندر کے مناظر کو بہت ہی متاثر کن انداز میں بیان کیا ہے۔ ٹرین کا چلنا رکنا،ٹرین پرحملہ ہونے کی افواہ کا اڑنا اورلدھیانہ اسٹیشن پرسکھ شرنارتھیوں کا ان مہاجروں کوگھور کر دیکھنا، تلواریں چمکانا اور اکڑ کر چلنا ایسے بیان کیا گیا ہے جیسے یہ سب خود انتظار حسین کے ساتھ بیتا ہو، ان مناظر کو اگر فلموں میں فلمایا جائے تو اور بھی متاثر کن بن جائے گا۔اٹاری اسٹیشن پار کر کے حسن پورمہاجرین جب پاکستان کی سرحد میں داخل ہوتے ہیں تب ان کے اور بالخصوص مسلم لیگیوں کے رویے میں اچانک جو تبدیلی آتی ہے اس کو بھی بڑے ہی دلچسپ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

سبطین پاکستان پہنچ کر وہاں بھی اخبار نکالتا ہے لیکن پھرناکامی ہاتھ لگتی ہے۔مسلم سماج کا جو حال ہندستان میں ہوتا ہے بعینہٖ وہی حال پاکستان میں ہوتا ہے۔ جب سبطین فیاض خان سے اخبار کا ذکر کرتا ہے تو وہ اسے منع کرتا ہے اور خبردار کرتا ہے کہ اخبار نہیں چلے گا۔

''سبطین نے تاؤ میں آکر کہا چلنے نہ چلنے کا ذکر کیوں کرتے ہو۔ہم یہاں پر چون کی دکان نہیں کھول رہے ہیں۔اس کا مقصد تو قوم کے ضمیر کو بیدار کرنا ہے۔

فیاض خان تڑک کر بولا'' قوم کے پاس ضمیر ہی کہاں ہے؟ بیدار کیسے کروگے؟''(۱۳)

لیکن سبطین ہمت نہیں ہارتا ہے۔وہ ہندستان کی ناکامی کو پاکستان میں نہیں دیکھنا چاہتا ہے۔اسے لگتا ہے کہ یہ نیا ملک ہے،مسلمانوں کی نشاۃ الثانیہ ہے اب مسلمان بیدار ہو چکے ہیں۔اس قوم سے چندہ بھی ملے گا اور اخبار بھی دھوم دھام سے چلے گا۔اخبار نکالنے کی گہما گہمی دیکھ مزمل اور اجمل بھی اس کے ساتھ جڑ جاتے ہیں۔بات

روز نامہ نکالنے کی آتی ہے۔ مسلم لیگی حق صاحب یہاں بھی ڈینگ ہانکتے ہیں کہ وہ اخبار کے دفتر کے لئے جگہ ہی نہیں بلکہ اپنے اثر ورسوخ سے پاکستان کے رؤسا سے اچھا خاصا چندہ بھی کروادیں گے۔ سبطین اوراس کے ماتحت مزمل اوراجمل اس امید میں دردر کی خاک چھانتے ہیں اورسوالی بنتے ہیں لیکن ناکامی ہاتھ لگتی ہے۔ حق کی امید چھوڑ چھاڑ وہ نمبر وانی کے پاس آتے ہیں۔ نمبر دانی اخبار رجسٹریشن کا کام فوری نپٹا دیتا ہے لیکن چندہ کا معاملہ پھنس جاتا ہے۔ اخبار نکالنے کے لئے مطلوب رقم کوشش کے باوجود جمع نہیں ہو پاتی ہے۔

فیاض خان پاکستان میں گھوم گھوم پوری مسلم سوسائٹی کا مشاہدہ کرتا ہے لیکن اسے وہاں بھی کوئی امید نظر نہیں آتی ہے۔ ذیلی کردار علن پٹواری اور کالے خان nostalgia کے شکار ہوجاتے ہیں۔ پاکستان میں رہ رہ انھیں اپنا گھر یاد آتا ہے۔ حسن پور کی محفلیں یاد آتی ہیں۔ مسلم لیگی وہاں اپنی خدمات کا رونارو کر گھر کارخانے ہتھیا لیتے ہیں لیکن فیاض خان اور سبطین قوم کے فراق میں پڑے پڑے مایوسی کی دَل دَل میں پھنس جاتے ہیں۔ فیاض خان کو آخر میں احساس ہوتا ہے کہ اس نے اپنی زندگی ضائع کردی اوراس کی روح گہنا گئی ہے۔ جیسے چاند گہنا گیا ہے۔

تقسیم کے دوران ہندو مسلم فسادات کو بھی اس ناول میں کرداروں کی زبانی ادا کرایا گیا ہے۔ ان ہی فسادات کی بنا پر لوگ اپنے آبائی گاؤں اور محلے چھوڑ کر فرادکی زندگی گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ان فسادات کی جڑیں انگریزوں کی سازشوں میں نظر آتی ہے اور ناول کے باشعور کردار اس پر یوں تبصرہ کرتے ہوئے عجیب قسم کے تذبذب کا شکار نظر آتے ہیں۔ ناول کے اس اقتباس کو دیکھئے:

> ”علّن نے بہت سنجیدگی سے جواب دیا:” جب اچھی طرح لڑائی ہو لے گی تو انگریز ہندوؤں، مسلمانوں دونوں کو بلائے گا، کہے گا میاں کس برتے پر تتّا پانی۔ حکومت تمہارے بس کا روگ نہیں ہے۔ پھر دونوں کو ٹھوکر مار کے کہے گا، ہٹو جی ہندستان، پاکستان دونوں ختم بس ہم حکومت کریں گے۔“ (۱۴)

تقسیم اور ہجرت کے نتیجے میں لوگ گھر سے بے گھر ہوگئے ۔ سر چھپانے کے لئے کہیں جگہ نہیں ملتی، دونوں طرف سے ہجرت کے قافلے آتے رہتے ، اکثر کی موت ان کی منزل تک پہنچنے سے پہلے ہوتی، جو منزل پر پہنچ بھی جاتے ان کی زندگی بھی آسان نہیں رہتی طرح طرح کی مشکلات سے گھرے رہتے ۔ اس ضمن میں ناول کے ایک کردار کا یہ احوال ملاحظہ فرمائے:

''بڑی مشکل سے پاؤں نکانے کی جگہ ملی ہے ۔ اسے مکان کہنا تو کچھ مبالغہ ہی ہوگا ، ایک زمانہ تھا کہ دلّی میں رہنے کو جگہ مل جاتی تھی ۔ کھانے کو نہیں ملتا تھا ۔ اب یہ زمانہ ہے کہ یہاں نوکری مل جاتی ہے مکان نہیں ملتا ۔ میں تو اس پر حیران ہوں کہ یہاں سے روز مسلمانوں کے قافلے پاکستان روانہ ہوتے ہیں، لیکن کیا مجال کہ کسی مسلمان محلّہ میں کوئی مکان خالی نظر آجائے ۔ مکین تو پاکستان چلے جاتے ہیں مگر مکان کہاں جاتے ہیں ۔''(۱۵)

انتظار حسین کی طرح ہی ان کے کردار بھی تقسیم ہند اور ہجرت سے نالاں و ناراض ہیں ۔ تقسیم کے بعد فرقہ وارانہ فسادات اور ہجرت کے قافلوں پر قاتلانہ حملے روز کا معمول بن گیا تھا ۔ لوگ اس قدر خائف تھے کہ وہ لفظ آزادی کو ہی کوسنا شروع ہوگئے بلکہ اس کے لئے تو آزادی نہیں چاہیئے تھی کہ پورے ہند میں نفرت کی آگ پھیل جائے ، انسان انسان کے خون کا پیسا بن جائے اور درندگی کی ہر حد کو پار کر دے ۔ آزادی کے بعد تقسیم اور اس کے نتیجے میں ہونے والی دردناکی ہجرت نے لوگوں کو آزادی سے متنفر کر دیا تھا ۔ اس لئے کہ لوگوں نے ظالموں سے نجات پانے کے لئے جدوجہد آزادی میں جانی مالی قربانیاں دی تھی ۔ پر اب تو گھر گھر ظالم گھر گھر قاتل ہے ۔ یہ آزادی لوگوں کو منظور نہیں ۔ اور ان کرب انگیز خونی واقعات کو انتظار حسین نے یوں بیان کیا ہیں:

فرنگی کے لفظ پہ بوجی کو فوراً غدر یاد آ گیا ''اے ہے ان کمبختی مارے گوروں نے تو غدر میں بھی بہتیری آفت بوئی تھی ۔ موئے جنیں کب

یاں سے دفان ہوں گے۔''

فرحت اس بحث میں شریک ہونا اپنے شایان شان نہیں سمجھتی تھی ۔لیکن بوجی کی بے خبری کو دیکھ کر اس سے رہا نہ گیا ۔آخر بول ہی پڑی۔''بوجی آپ کون سی دنیا میں رہتی ہیں ۔انگریزوں کی حکومت تو ختم بھی ہوچکی ۔ ہندستان اور پاکستان کوآزادی مل گئی ہے۔''

آزادی کے لفظ پر نمبر دارنی بہت بپھریں:

''آزادی............آزادی............اس لُچّی حرامزادی آزادی کی تو ناک چوٹی کاٹ کے جوتیں مار مار کے باہر دھکے دے دیئے جائیں۔ چھنال نے آتے ہی خون خچر کردایے۔''(۱۶)

انتظار حسین نے ناول''چاند گہن''میں اتر پردیش کے حسن پور نامی ایک قصبے کی تقسیم کے وقت بدلتے حالات اورنفرت کی فضا کو پھیلتے ہوئے دکھایا ہے ۔کس طرح اس قصبے میں انسان انسان کا جانی دشمن بنا اور تمام تر رواداریاں اور بھائی چارے کی روایت کو بھول گیا۔ یہ کدورت آمیز فضا رفتہ رفتہ سارے قصبے کو اپنی لپیٹ میں لیتی ہے اور ہر کچے پکے گھر میں نفرت راج کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ان سارے بدلتے دل دوز ودل خراش حالات کے کرب کو مصنف نے یوں رقم کیا ہیں:

''سنتے ہیں کہ وقت بدلتے بدلتے بدلتا ہے ۔مگر حسن پور میں تو وقت آناً فاناً بدلا۔ساری وضعداریاں یکا یک بالائے طاق رکھ دی گئیں۔ میل لاپ ختم ۔لین دین بند۔شبہ اور نفرت نے زور باندھا۔ پنجاب سے آنے والے شرنا تھی حسن پور کے لئے دو تحفے لائے تھے ۔نفرت کا جذبہ اورانتقام کا جوش یہ دونوں چیزیں ساری فضا پر چھا گئیں،طبیعتوں میں رَچ گئیں۔ یوں معلوم ہوتا کہ حسن پور والے بکٹٹ گھوڑوں پرسوار ہیں اور یہ

گھوڑے ایک اتھاہ کھائی میں اترے چلے جارہے ہیں۔''(۱۷)

تقسیم ہند اور ہجرت کے یہ کرب انگیز واقعات شہر شہر گردش کرتے گئے اور ہر گلی کوچہ قتل گاہ میں تبدیل ہوتی گئی۔ بٹوارے کے ان دل دوز واقعات کو انتظار حسین نے بڑی دردمندی سے پیش کیا ہے۔ موصوف نے اپنے ناول ''چاند گہن'' میں جا بجا ہجرت اور فسادات کو براہ راست بیان کیا ہے۔ کس طرح فرقہ وارانہ فسادات ہر شہر کو اپنی زد میں لیتے ہیں اس کا ذکر انتظار حسین کچھ یوں کرتے ہیں:

''دن گزرتے گئے اور یہ غیر معمولی کیفیت معمول بن کر رہ گئی۔ ہراس زندگی کا جز بن گیا۔ افسردگی فضا کی نس نس میں رچ گئی۔ مغربی پنجاب سے شرنارتھیوں کی آمد کا تانتا بندھا رہا۔ پھر دلی کے فساد کی خبریں آنی شروع ہوئیں۔ یہ خبر زیادہ ہولناک، زیادہ دہشت خیز ہوتی گئیں۔ فضا میں اینٹھن کی کیفیت اور زیادہ شدید ہوگئی اور بالآخر ایک روز مادّہ پھٹ پڑا۔''(۱۸)

دہلی کے فسادات اور وہاں پر رونما ہونے والے خوف و ہراس کی کیفیت جو ہر چہرے سے نمایاں تھی۔ اسے بھی مصنف نے اس ناول میں بیاں کر کے تقسیم کو ہر ہندستانی کے لئے ایک دہشت کا پیغام کیا ہے۔ دلی پر فسادات کا سایہ کس طرح سے رقص کرتا ہے اور دلی کی عوام اس کے تلے خوف سے سہمے ہوئے زندگی کے لمحے گن گن کر گزارتی ہیں۔ انھیں موت آنکھوں کے سامنے رقص کرتی ہوئی، عزتیں لٹتی ہوئی اور انسانی اقدار کی پامالی گلی گلی، محلّہ محلّہ دکھائی دیتی ہیں۔ اس ہولناک کیفیت کو انتظار حسین نے مذکورہ ناول میں اس طرح رقم کیا ہیں:

''دن کے متعلق آخر کیا لکھو۔ دن ہے کہاں۔ دلی میں جب دن نکلے گا، دیکھا جائے گا۔ اب تو رات کا تسلط ہے۔ ایک خوفناک ہنگامہ خیز رات ہے جس نے پوری دلّی کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ رات محلّہ کے ہر شخص کو یقین تھا کہ حملہ ہوگا مگر حملہ نہیں ہوا۔ قیامت سر پر

آ آ کرٹل جاتی ہے ۔ یہ تذبذب کی کیفیت سخت اذیت ناک ہے ۔ قیامت کو اگر ٹوٹنا ہی ہے تو ٹوٹ کیوں نہیں پڑتی ۔ یہ تو ایسی ہی بات ہے کہ مجرم کو پھانسی کے تختے پر کھڑا کر دیا اور جلاد کہیں کہ ہم حقی پی کر آتے ہیں ۔ پھر تجھے پھانسی لگائیں گے ۔ یہ پورا محلّہ پھانسی کے تختہ پر کھڑا ہے ۔ پھانسی کا پھندا سر پر لٹک رہا ہے ، گلے میں نہیں آتا ۔ لوگ اسے غنیمت سمجھتے ہیں اور میں کہتا ہوں کہ پھانسی تکلیف دہ نہیں ہوتی ۔ پھانسی لگنے کا احساس تکلیف دہ ہوتا ہے ۔(۱۹)

ناول میں ہجرت کرنے وےلے کرداروں جو کی بے بس کو مصنف نے بیان کرتے ہوئے یہ دکھانے کی سعی کی ہے کہ کس کرب سے مہاجر گزرے اور کن کن مصائب ولآم سے دو چار ہوئے ۔ اپنے آبائی گھر چھوڑ کر بے سروسامان فراد کی زندگی اختیار کرنے پر سوائے فسادات کے کسی اور چیز نے انھیں مجبور نہیں کیا ۔فرقہ وارانہ فسادات ہی نے لوگوں کو ہجرت کرنے پر مجبور کیا ۔ یہ اقتباس دیکھئے :

''نمبر دار صاحب اور حق صاحب نے تو فساد ہوتے ہی ہجرت کی تجویز پیش کر دی تھی ، مگر وہ ایسا اڑا کہ ان کی بات چلنے ہی نہ پائی ۔لیکن آج ان کی بات خود بخود چل گئی تھی اور وہ اسٹیشن پر حیران و پریشان کھڑا تھا ۔ وہ شخص جس نے اپنی ایک عمر مسلمانوں کے زوال کے اسباب سمجھنے اور ان کی توجیہات کرنے میں صرف کی تھی ، آج حسن پور کے اسٹیشن پر مجسم سوال بنا کھڑا تھا ۔اس کی سمجھ میں خاک نہیں آ رہا تھا کہ آخر یہ سب کچھ کیسے ہوا ۔سبطین حیران تھا اور کالے خاں اور علن اور رفیا بھی حیران تھے ۔حسن پور کے یہ ہیرو ، اوپر کوٹ کے یہ مڈہ آخر کیوں جا رہے ہیں سب اپنا اپنا سامان لے کر نکلے تھے ۔''(۲۰)

حسن پور سے ہجرت کرنے والوں کا قافلہ کس غم اور ماتم کے انداز میں روانہ ہوتا ہے اور کس طرح حسن پور کے مکانات کے نقوش مدھم پڑتے جاتے تھے۔ جوں جوں گاڑی کی رفتار تیز ہوتی جارہی تھی پھر آہستہ آہستہ فاصلہ کی دوری میں یہ سب تحلیل ہوجاتا ہے۔ ہجرت کرنے والوں کی غم انگیز کیفیت کو مصنف نے یوں بیان کیا ہے کہ:

''بو جی کی پلکوں پر دیر سے ایک قطرہ کانپ رہا تھا۔ انھوں نے دو پٹے کے آنچل سے آہستہ سے آنکھ کو پونچھا۔ پھر برقعہ کی نقاب گری اور بو جی نے سر اندر کرلیا۔

''مگر اس کا شوہر کہاں ہے؟'' فیاض خاں نے بہت آہستہ سے پوچھا۔

''فساد میں مارا گیا۔''

سبطین جل کر بولا...... ''اس کے مرنے کی بڑی خوشی ہوئی تھیں۔''

''ایک شخص کا مرنا بھی کوئی مرنا ہے کہ اس کی خوشی کی جائے۔'' (۲۱)

ہجرت کے قافلے کس طرح سرحد کے دونوں طرف سے آتے جاتے تھے اور خوف و ہراس کے ماحول میں ہر آنے والے کو ہر پل موت کا سامنا تھا۔ رات کی خاموشی اور اندھیرے میں بھی ہجرت کے قافلوں پر حملے ہوتے تھے۔ ہجرت کرنے والے لوگوں کی رودادِ سفر کو مصنف کی ذیل میں دی ہوئی ان سطور سے سمجھا جاسکتا ہے جن میں ان پر طاری خوف اور در بہ در کی ٹھوکریں دکھائی گئی ہیں:

''فضا ڈراؤنی، مناظر یکساں اور بے کیف اسٹیشنوں کو دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ برسوں سے ان میں جھاڑو نہیں دی گئی۔ کھیت اور میدان اجاڑ سنسان۔ جابجا مویشیوں کے ڈھانچے اور اکادکا انسانی لاشیں، جلی پھنکی بستیاں، مسمار مسجدیں، بربادی کے مناظر میں بھی کتنی یکسانیت ہوتی ہے۔ بہت دور میدان میں ایک ادھ مرے سانپ کی طرح بل کھاتا ایک

طول طویل قافلہ رینگتا چل رہا تھا۔ خاک آلود چہرے، خوف سے لرزتے ہوئے جسم، وحشت آلود آنکھیں نہ معلوم کیسے کیسے معرکے مارے ہوں گے اور کیسے کیسے سورماؤں سے ٹکریں لی ہوں گی۔ مگر وقت کی ایک جنبش نے انھیں بزدل بنادیا تھا اور وہ اپنے خون سے سینچی ہوئی زمینوں کو، اپنی آبائی بستیوں کو، یوں چھوڑ چھاڑ کر بھاگ رہے تھے جیسے بھونچال میں لوگ گھروں کو چھوڑ چھوڑ کر بھاگتے ہیں۔ ان کے پیچھے پیچھے پیدل قافلہ تھا۔ بوڑھے، نوجوان، بوڑھی عورتیں، حاملہ عورتیں، بچیاں، غرض ہر قسم کے لوگ تھے۔ نوجوان عورتیں بھی تھیں، مگر نسبتاً کم۔ ڈھائی تین گھنٹے میں خدا خدا کر کے یہ قافلہ ختم ہوا۔''(۲۲)

الغرض اس ناول کے زیادہ تر کردار پاکستان میں نئی صورتحال سے مفاہمت نہیں کر پاتے ہیں اور اس پر مستزاد ان کے یہاں پائے جانے والا زیاں کا شدید احساس ہے۔ اس وجہ سے اس ناول کے بیشتر کردار بے گانگی اور مغائرت کے شکار ہیں۔ تقسیم ہند کے فوراً بعد پاکستانی معاشرے میں اقتصادی ترقی اور معاشی استحکام کے لئے جو Rat-Race شروع ہوجاتا ہے اور جس کے نتیجے میں اخلاقی اقدار واصول کی جس قدر پامالی ہوتی ہے اس کے سبب متعلقہ افراد تشکیک اور بے گانگی میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ کالے خاں ہندستانی افواج سے لڑتے ہوئے مارا جاتا ہے، فیاض کو محبت اور زندگی دونوں میں ناکامی ہوتی ہے۔ سبطین کے یہاں گو کہ کوئی واضح نصب العین نہیں ہے لیکن کم از کم وہ حالات سے بالکل دل برداشتہ نہیں ہے۔

''چاند گہن'' بنیادی طور سے آئیڈیلز (Ideals) کے ٹوٹنے کی کہانی ہے۔ پہلے یہ آئیڈیلز چکنا چور ہوتے ہیں جب تقسیم ہند کے دوران یوپی کے بیشتر علاقے فرقہ وارانہ فسادات کی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔ حسن پور میں صدیوں سے آباد رہنے والے ہندو مسلم ابھی دوقومی نظریے، کانگریس اور مسلم لیگ کی سیاست، جناح اور نہرو کے اختلافات اور ہندو مسلم نفاق کی ماہیت اور ان کے اثرات کو سمجھنے کی کوشش ہی کررہے تھے کہ فرقہ وارانہ فسادات

شروع ہوگئے اور آپسی وضع داریاں نفرت کی نذر ہو جاتی ہیں۔ حسن پور کے یہ باسی بھی ہجرت کر کے لاہور پہنچے۔ لاہور میں الاٹ منٹ (Allotment) اور لوٹ کھسوٹ کا ماحول ان آئیڈیلز کو ایک بار پھر ریخت کر دیتا ہے اور سوائے شکست خوردگی کے متعلقہ افراد کے ہاتھ کچھ اور نہیں لگتا ہے۔

اس سلسلے میں ناول سے نقل کئے گئے ان اقتباسات کو دیکھئے جو اس بات کا ثبوت پیش کرتے ہیں:

اول: ''تم کہاں کے رہنے والے ہو جی؟''

''امرتسر کا۔''

''امرتسر ختم کر کے آئے تھے یا پہلے ہی آگئے تھے؟''

دوم: ''جی کیا بتاؤں جی۔ جب امرتسر میں گولے چھٹنے لگے تب میں وہاں سے نکلا۔ سارا مال میرا غارت ہوگیا۔ جی کیا بتاؤں۔ امرتسر میں میرا بہت بڑا ہوٹل تھا۔ یہاں میں کابک میں بیٹھا ہوں اور پھر بھی الاٹمنٹ والے آ آکے تنگ کرتے ہیں۔''(۲۳)

''کئی ماہ تک علّن کا کوئی ٹھکانا نہ ہو سکا۔ اس کی دکان کیا چھٹی، وہ اچھا خاصا گھن چکر بن گیا۔ اس کے مطالبات کچھ بہت لمبے چوڑے نہیں تھے۔ اسے ایک چھوٹی سی دکان کی تلاش تھی جہاں وہ تھوڑا بہت سودا خرید کر سجالے اور اپنی کھوئی ہوئی دکان کی یاد تازہ کرے۔ مگر اس کی یہ خواہش پوری نہ ہوئی۔''(۲۴)

(ب) ناول بستی 1980ء کے حوالے سے

اس ناول کا موضوع جلاوطنی، ہجرت اور مشرقی پاکستان کا المیہ ہے۔ مصنف جو ہجرت کا ذاتی تجربہ رکھتے ہیں اور اُتر پردیش کے ایک قصبے ڈبائی سے ترکِ سکونت کر کے ۱۹۴۷ء میں پاکستان کے شہر لاہور چلے جاتے ہیں۔ اس ناول کو انتظار حسین کی آپ بیتی بھی کہا جاسکتا ہے۔ اس لئے کہ اس ناول کے مرکزی کردار ذاکر، میں مصنف کو دیکھا جاسکتا ہے۔ اس ناول کا نام بستی کیوں رکھا گیا اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے۔

> ''میں اس شہر کے لئے اور کچھ نہیں کرسکتا ہوں، دعا کرسکتا ہوں۔ سو کرتا ہوں یہ میرے تصور میں آباد روپ نگر کے لئے بھی دعا ہے کہ میں اُسے اب اس شہر سے الگ کر کے تصور میں نہیں لاسکتا۔ روپ نگر اور یہ شہر میرے اندر گھل مل کر ایک بستی بن گئے ہیں۔'' (۲۵)

''بستی'' (۱۹۸۰ء) انتظار حسین کا شاہکار ناول ہے جس کا موضوع پاکستان کے مہاجرین کے المناک مسائل سے متعلق ہے۔ فرقہ وارانہ فسادات کے نتیجے میں جبری ہجرت نے تقسیم ملک کو تہذیبی سطح پر ناقابل فراموش المیہ بنادیا۔ ''بستی'' کی ابتداء پیدائش آدم اور ان کے دو بیٹوں قابیل اور ہابیل کے درمیان ہونے والی جنگ اوّل سے ہوتی ہے۔ یہ پہلی جنگ قتل کا باعث بنی تھی اور اس کے بعد سے جنگیں ہوتی رہتی ہیں اور انسان قتل ہوتے رہتے ہیں۔ اسی قتل و غارت گری کی ایک علامت تقسیم ملک ہے جس کو انتظار حسین نے بڑی کامیابی سے ناول کے مرکزی کردار ذاکر اور اس کے کنبے کے حوالے سے پیش کیا ہے۔ تقسیم ہند کے بعد یہ کنبہ منتشرہ ہوجاتا ہے۔ ذاکر کی خالہ زاد بہن صابرہ جو کنبہ کا ایک حصہ تھی، ہندستان میں رہ جاتی ہے۔ دوسری خالہ زاد بہن طاہرہ کے شوہر کو مشرقی

پاکستان کے شہر ڈھاکہ میں ملازمت ملتی ہے اور وہ لوگ وہاں منتقل ہو جاتے ہیں۔ ذاکر اپنے والدین کے ہمراہ مغربی پاکستان میں سکونت اختیار کرتا ہے۔ پھر پاکستان کی خانہ جنگیوں کا ذکر ہے جس کے نتیجے میں بنگلادیش وجود میں آیا ہے۔اس ناول میں ایک کنبہ کے تین مختلف ممالک میں آباد ہونے کی کہانی ہے۔جن میں اس طرح کے کنبے کے لوگ تینوں ملکوں میں امن وامان کے خواستگار رہتے ہیں۔اس لئے جب ہندو پاک جنگ شروع ہوگئی تو ذاکر کے کنبہ کا سکون چھن گیا۔انتظار حسین نے مہاجروں کی زندگی کی چابکدستی سے تصویرکشی کی ہے اور ان کے سماجی، اقتصادی اور ثقافتی مسائل کا سائنسی نظر سے تجزیہ کیا ہے۔

> ''بستی'' کا قصہ زیادہ تر ان چہروں اور ان لمحوں کو یاد کرنے کے عمل سے وابستہ ہے جنہیں وقت نے دور کردیا ہے۔ انتظار حسین کی دانست میں یادداشت انفرادی اور اجتماعی تشخص کی بنیاد ہے۔یادداشت نہ ہوتو ماضی بھی نہیں رہتا اور ماضی نہ ہوتو بنیاد اور جڑ میں کچھ نہیں رہتا۔''[۲۶]

یہ سچ ہے کہ انتظار حسین کا بنیادی تجربہ ہجرت کا ہے۔ہجرت اس معنی میں نہیں کہ کچھ افراد ایک جگہ سے اٹھ کر دوسری جگہ چلے گئے بلکہ وہ ہجرت کو ایک داخلی اور روحانی تجربے کے طور پر محسوس کرتے ہیں۔انہوں نے واردات کا لفظ خاص طور پر استعمال کیا ہے اور بعض انٹرویوز میں یہ واضح کیا ہے کہ دراصل واردات تجربے سے ہم آہنگ ہے اور یہ تجزیہ انہیں ہجرت کے پس منظر میں حاصل ہوتا رہا ہے۔

دراصل ہجرت تو دوسرے مرحلے میں بازیافت کے امکانات سے بھی عبارت ہے، یہ ممکن ہو یا نہ ہو۔ ''بستی'' میں یہ صورت بہت نمایاں ہوگئی ہے۔ایک طرف تو وہ یادداشت کا بوجھ ہے جو بستی کی ایک ایک بات ذہن کے نہاں خانے میں ابھرتی ہے۔ دوسری طرف یہ بازیافت کا عمل بھی ہے، چاہے وہ ذہنی سطح پر ہی محدود ہو۔ گویا یہاں مراکز یعنی چھوٹا ہوا مرکز اور نیا مرکز ہم آمیز ہو جاتے ہیں اور بستی ایک میٹافور بن جاتی ہے۔''بستی'' کے پانچ مناظر ہیں اور یہ پانچوں مناظر ایک دوسرے سے پیوستہ ہیں مثلاً کائنات، روپ رنگ، مشرقی پاکستان، مغربی

پاکستان اور شیراز ۔ یہ سب یادوں کی جہت بھی ہیں اور نئے تناظر کی علامتیں بھی جن میں ہند اسلامی تہذیب اوراسلامی تاریخ پھرعصری منظر نامہ سب ایک ہوگئے ہیں ۔

یہ دلچسپ بات ہے کہ انتظار حسین کچھ بھول نہیں سکتے اور جو کچھ یاد آتا ہے وہ نئے تجربے سے ہم آہنگ ہوکرتخلیق کی سطح پر نمایاں ہوجاتا ہے۔ ''بستی'' اس کی ایک واضح مثال ہے۔

''بستی'' اس یقین کو پیش کرتا ہے کہ یادداشت انفرادی شخصیت کی بنیاد ہے ۔ یادداشت کے ذریعے ہی ہماری اجتماعی زندگی اپنے ماضی کوامید میں بدلتی ہےاورزندہ رہنے کاعمل جاری رہتا ہے۔اسی لئے انتظار حسین کافن اپنی قوت ان سرچشموں سے حاصل کرتا ہے جوتہذیبی روایات کا منبع ہیں،یعنی یادیں،خواب،انبیاء کے قصے، دیومالا، توہمات وغیرہ انتظار حسین کے شعور واحساس کے ذریعہ ایک گم شدہ دنیا پھر سے اپنے خدوخال کے ساتھ نکھر کر سامنے آجاتی ہےاوراز سرنو بامعنی بن جاتی ہے ۔گمشدہ مقامات اور رشتوں کی یاد ایک کسک کے روپ میں ملاحظہ کیجئے......

> '' جیسے اس کا بچپن روپ نگر میں رہ گیا تھا ۔ روپ نگر میں کیا کچھ رہ گیا تھا۔ کچے پکے راستے جو جانے کہاں جا کر نکلتے تھے،بس درختوں میں گم ہوتے تھے ۔ ڈولتے ، ہچکولے کھاتے اٹے ، اونگھتی رینگتی بیل گاڑیاں وہ مٹی میں اٹے رستے ایک میٹھے شور سے بھر جاتے تھے،کالا مندر، کالے مندر کے احاطے میں کھڑا بندروں سے آباد بڑا پیپل،کربلا کی ویران اوراداس فصیل،ٹیلوں والا قلعہ بھید بھرا برگد،بس ایک پورا دیومالائی عہد جوروپ نگر کے ساتھ رہ گیا تھا۔''(۲۷)

انتظار حسین کا بنیادی تجربہ ہجرت کا تجربہ ہے۔ہجرت کا احساس ان کے اسلوب کا اہم ترین محرک ہے، جو''بستی'' میں ایک دھیمی آگ بن کر پورے وجود میں گداز پیدا کردیتا ہے اور ایک انسانی مسئلہ بن جاتا ہے ۔ ''بستی'' سے انتظار حسین کا یہ بنیادی تصور واضح ہوتا ہے کہ آدمی صرف اتنا کچھ نہیں جتنا وہ نظر آتا ہے، بلکہ اس کے

رشتے خارج سے زیادہ اس کے باطن میں پھیلے ہوتے ہیں۔انہیں شدت سے اس کا احساس ہے کہ ان کی ذات کا کوئی حصہ کٹ کر ماضی میں رہ گیا ہے اور موجودہ معاشرے کی کوئی تصویر اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتی جب تک ماضی کے کٹے ہوئے جوے کو تخیل کے راستے واپس لا کر ذات میں نہ سمویا جائے۔

ہجرت کا کرب اور نقل مکانی کا مسئلہ تقسیم کے بعد کا سب سے بڑا الم ناک سیاسی مسئلہ تھا۔ان کے سبھی ناولوں میں ہجرت کی صعوبتوں اور اذیتوں کی داستانیں ملتی ہیں۔انھوں نے ہجرت کے موضوع کو خارجی شکل میں دیکھنے کے بجائے داخلی سطح پر بھی محسوس کیا ہے۔اپنی مٹی سے اجڑنے اور نئی زمین میں بسنے کے دردناک واقعات ان کے ناولوں میں جگہ بناتے ہیں۔انتظار حسین کو خود تقسیم ہند کے بعد ہجرت کا کرب سہنا پڑا۔ان کا یہ خیال کہ جو لوگ اپنی زمین سے بچھڑ جاتے ہیں پھر وہ دربدر ٹھوکر کھاتے ہوئے زندگی گزارتے ہیں۔کوئی زمین، کوئی مٹی انھیں پورے طور سے قبول نہیں کرتی اور انتظار حسین کا یہی خیال غالباً ان کے تخلیقی عوامل کا اہم محرک بنا۔

''بستی'' ان کا ایک ایسا ناول ہے جس میں ناول نگار نے مشرقی اور مغربی پاکستان کے عوام بالخصوص نوجوانوں، دانش وروں، فن کاروں، انقلابیوں، مذہب پرستوں، فن کاروں کی ذہنی بے ضابطگی اور بے سمتی، نیز کوفتوں وکیفیتوں کی عکاسی کی ہے۔انتظار حسین نے اس حوالے سے اپنی تخلیقی دنیا کا تانا بانا روایت کے اس سرے سے جوڑا ہے جس میں اساطیری ودیو مالائی کتھاؤں کے ساتھ ساتھ کربلائی واقعات وسانحات بھی موجود ہیں اور ایک مٹتی ہوئی، ماند پڑتی ہوئی مشترکہ کلچر کے عناصر بھی موجزن ہیں۔

> ''جب میں گھر سے چلا تھا تو میرے سارے بال سیاہ تھے۔
> اس وقت میری عمر ہی کیا تھی، بیس اکیس کے لپیٹے میں تھا۔جب پاکستان پہنچا اور نہانے کے بعد آئینے دیکھا تو میرے سر کے سارے بال سفید ہو چکے تھے۔پاکستان میں میرا پہلا دن تھا۔گھر سے کالے بالوں اور خاندان والوں کے ساتھ نکلا تھا۔پاکستان پہنچا تو میرا سر سفید تھا اور میں اکیلا تھا۔'' (۲۸)

انتظار حسین نے اس ناول میں ۱۹۷۱ء کی ہندوپاک جنگ کے دوران پھیلے ہوئے انتشار افراتفری اور بدامنی کے ماحول میں وہاں کے عوام کی ذہنی وجذباتی کیفیت کی منظر کشی بڑے معروضی انداز میں کی ہے۔ جنگ کے لرزہ خیز ماحول میں بنگلہ دیش میں مقید پاکستانیوں کے لئے ان کے اہل خانہ کی بے چینی اور تشویش کا بھی اظہار ملتا ہے۔ جب پاکستان کا ایک حصہ بنگلہ دیش اس سے کٹ کر الگ ہو رہا تھا اور قومی یکجہتی اور سالمیت کا شیرازہ بکھر رہا تھا۔

''بستی'' کا درد وکرب دراصل ان کا دکھ اور غم ہے جو اپنی بستیوں سے اکھڑ کر یہاں آباد ہوئے لیکن ان کے اذہان ہمیشہ انتشار اور خوف میں مبتلا رہے۔ انتظار حسین کے اس نوع کے اکثر کردار مخالف حالات میں خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔ ان کے اندر عدم تحفظ کا احساس جڑ پکڑنے لگتا ہے۔ ان کے سامنے انسانوں کے ذریعہ انسانوں پر ڈھائے گئے مظالم ومصائب بربریت وبہیمیت، قتل اور خون ریزی کے مناظر سامنے آتے ہیں۔ اسی پس منظر میں ناول نگار کا دل کس طرح گریہ وزاری کرتا ہے، اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''روپ نگر میں کیا کچھ رہ گیا تھا۔ کچے پکے راستے، جو جان کہاں جا کر نکلتے تھے۔ بس درختوں میں گم ہوتے دکھائی دیتے تھے۔ ڈولتے ہچکولے کھاتے یکے، اونگھتی، رینگتی بیل گاڑیاں...... کالا مندر، کالے مندر کے احاطے میں کھڑا بندروں سے آباد بڑا پیپل، کربلا کی ویران اور اداس فصیل۔ بس ایک پورا دیو مالائی عہد تھا، جو روپ نگر کے ساتھ رہ گیا۔''(۲۹)

روپ نگر کے دیہی علاقے سے اس قصّے کی شروعات ہوتی ہے، جہاں کی حیات بخش تہذیبی فضا میں اخلاقی قدروں کی تابندگی موجود ہے۔ حیات وکائنات کے انمول راز سے پنڈت اور ملا دونوں واقف ہیں۔ اپنے اپنے عقائد وایمان پر سب ایستادہ ہیں۔ ہندو مسلمان سبھوں کے مسائل دکھ سکھ یکساں ہیں۔ فطرت کی عطیات ونوازشات سے فرد کی بجائے پوری جماعت اور کنبے کی بجائے پورا معاشرہ فیض یاب ہوتا ہے۔ اسی طرح قدرت

کی نامہربانیوں اور حالات کی ستم ظریفیوں کا شکار پورا سماج ہوتا ہے۔ طاعون کی بیماری آتی ہے تو مذہب ومسلک، جنس وعمر کا لحاظ کیے بغیر سبھی کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے اور جب جاتی ہے اتو پوری بستی، پورا معاشرہ راحت کی سانس لیتا ہے۔ روپ نگر کے باسی ذاکر بھی اسی معاشرہ میں معصومیت کے ساتھ پلتا اور بڑھتا ہے۔ وہ میرٹھ کے کالج میں زیرِ تعلیم ہے۔ چھٹیوں میں روپ نگر آتا ہے اور وہاں ایک ساتھ سریندر بھی اس کا منتظر رہتا ہے۔ یہاں ایک کردار صابرہ کا بھی ہے، جو ذاکر کی پسند تھی۔ بدلتے حالات اور تقسیم کے عمل نے صابرہ کو ہندستان میں تنہا کر دیا اور ذاکر اور دیگر لوگ پاکستان ہجرت کر جاتے ہیں۔

انتظار حسین ہمیشہ ذہنی طور پر پاکستان میں مہاجر ہی رہے۔ ان کے ناول کا بیانیہ بیش تر فکری رو اور ذہنی رویے کے مہاجرانہ انداز کا غماز ہے اور ان کے ناسٹالجائی کیفیات و احساسات کا آئینہ دار بھی۔ عام لوگوں کا خیال ہے کہ ہندستان کی ہجرت شدہ آبادی پاکستان میں مالی طور پر آسودہ حال ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ مالی آسودگی ہی دیگر تمام آسودگیوں کا بدل نہیں ہوسکتی۔ ''بستی'' کے ذیل کے اقتباس میں ناول نگار نے اس کی وضاحت یوں کی ہے:

> ''بھرے ہندستان میں اکیلی رہ جانے والی ایک مسلمان لڑکی، مجھے یہ بات عجیب لگی۔ مجھے یہ پتہ ہے کہ یہاں سے پورے پورے خاندانوں نے ہجرت کی ہے اور پیچھے کوئی ایک فرد رہ گیا ہے مگر یہ فرد بالعموم بوڑھا آدمی پایا گیا ہے۔ اکیلے رہ جانے والے ان بوڑھوں کو جائداد کے خیال نے نہیں روکا، قبر کے خیال نے روکا ہے۔ جائداد کا کیا ہے، اس کا تو پاکستان میں جا کر بھی کلیم کیا جاسکتا ہے اور جعلی کلیم داخل کر کے ہر چھوٹی جائداد کے بدلے میں بڑی جائداد حاصل کی جاسکتی ہے، مگر قبر کا کوئی کلیم داخل نہیں کیا جاسکتا۔'' (۳۰)

اس ناول کا زمانہ ۱۹۷۱ء کی ہند پاک جنگ اور سقوط ڈھاکہ کے آس پاس کا ہے۔ قیام پاکستان سے سقوط

ڈھاکہ تک آتے آتے عوام میں پاکستان اوراس کے خوشگوار مستقبل کے تئیں پائی جانے والی رومانی اور جذباتی توقعات کوایک بھرپور جھٹکا لگ چکا تھا، وہ سارے خواب بکھر گئے تھے کہ یہ ملک ملت اسلامیہ میں ایک روشن مثال بن کر ابھرے۔ اخوت ، بھائی چارہ ، برابری، یہ تمام اقدار سیاسی نعروں کی طرح کھوکھلے ثابت ہو چکے تھے اور نوجوان نسل اپنی پیش رونسلوں کوموجودہ صورتحال اورابتری کا ذمہ دارٹھہرا رہی تھی۔

''یار میں یہ محسوس کرتا ہوں'' سلامت بولا''یہ سفید سر والا آدمی میرے سفید سر والے باپ سے بھی زیادہ جاہل ہے۔''

''میرا باپ''، اجمل بولا''تیرے سفید سر والے باپ اور اس سفید سر والے آدمی دونوں سے زیادہ جاہل ہے۔''

''مگر میرا باپ، میرا باپ نہیں ہے'' سلامت نے دانت کچکچائے''میں حرام زادہ ہوں''

اجمل نے اعلان کیا:''میں اپنے باپ کو اپنا باپ ماننے سے انکاری ہوں۔''

''یار ہمارے مکروہ باپوں نے ہمیں برباد کرڈالا'' سلامت کی آواز میں یکا یک رقت پیدا ہوگئی۔(۳۱)

مشرقی پاکستان کے علیحدہ ہوجانے کا خطرہ اب سروں پر لٹکنے لگا تھا اور ہندستان وپاکستان کے مابین کشیدگی جنگ کے دہانے پر پہنچ چکی تھی۔ خوف و دہشت کے سائے طویل ہوتے جا رہے تھے۔ ہر آدمی سہما ہوا، اندیکھے اندیشوں میں مبتلا، مستقبل سے خوف زدہ، تشدد کی گرم بازاری اورنفرت کی تباہ کاری کے ثمرات پاکستانی معاشرے میں تیزی سے رونما ہونے لگے تھے۔

> ''گھروں میں ،دفتروں میں، ریستورانوں میں ، گلیوں، بازاروں میں سب جگہ ایک ہی نقشہ ہے۔ بحث پہلے نظریاتی، پھر ذاتی، پھر تکرار، پھر گالم گلوچ، پھر سر پھٹول، راہ چلتے لوگوں کا ٹھٹک کر کھڑے ہوجانا،لڑنے والوں کو دہشت سے تکنا، پھر ایک دوسرے سے پوچھنا کہ یہ کیا ہورہا ہے؟ کیا ہونے والا ہے؟ ہر ایک کی آنکھوں میں ایک خوف ،

جیسے واقعی کچھ ہونے والا ہے۔''(۳۲)

خوف ودہشت اور بے یقینی کی فضا پورے ناول میں جاری وساری ہے۔ دراصل انتظار حسین کے بیش تر ناولوں کی بنت اسی فضا میں ہوتی ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اپنے تجربے کے اظہار کے لئے وہ ایسی فضا کیوں خلق کرتے ہیں؟ کیا اس فضا کے بغیر یہ تجربہ اپنی ممکنہ جہات کے ساتھ منکشف نہیں ہو پائے گا؟

ہجرت کرنے والے اپنی آبائی زمین کو کب چھوڑتے ہیں؟ جب وہ خوف اور ظلم کے نرغے میں ہوتے ہیں۔ ان کی جان و مال اور عزت وآبرو کو خطر لاحق ہوتا ہے، یا یوں کہہ لیں کہ زمین ان پر تنگ ہوجاتی ہے۔ کہنے کا منشا یہ ہے کہ ہجرت کرنے والے خوف زدہ ہوتے ہیں اور یہ خوف ان کے باطن میں گھر کرلیتا ہے۔ اس لئے جب کبھی نئے وطن میں حالات خراب ہوجاتے ہیں تو وہی خوف واپس ان کی زندگیوں میں راہ پالیتا ہے۔ خوف ودہشت کے انہیں لمحات میں مہاجر کردار اپنی شخصیت کی پرتیں کھولتے ہیں اور ان کی شخصیت کی مختلف جہات آشکار ہوتی ہیں۔

انتظار حسین کی نظر میں ہجرت صرف سرحد پار کرلینے کا نام نہیں ہے بلکہ یہ اپنی ذات کے مرکز سے دور ہوجانے کا نام ہے اور جب آدمی اپنے مرکز (بستی) سے دور ہوتو خوف ودہشت اسے گھیر لیتے ہیں اور وہ بے اطمینانی میں گرفتار ہوجاتا ہے۔ علاوہ ازیں نئی جگہ پر اجنبیت محسوس کرنا انسانی سرشت میں داخل ہے۔ مقام ومعاشرے کی اجنبیت متعلقہ افراد کو بے اطمینانی، عدم تحفظ اور خوف میں مبتلا رکھتی ہے۔

انتظار حسین کے ناولوں میں پائی جانے والی خوف ودہشت کی فضا ان کی ناول نگاری کا خاص وصف ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ اسی فضا میں ان کے کردار اپنی شخصیت کو ظاہر کرتے ہیں، اپنے مسائل سے نبرد آزما ہوتے ہیں اور اپنی ذات کی سالمیت کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ جب باہر بہت ہنگامہ ہو، ابتری ہو، تب ان کے کردار ماضی کا سفر کرتے ہیں، یادوں کو کریدتے ہیں۔

''یہ ہماری یادوں کی واپسی کا موسم ہے۔ جانے کب کب کی
بھولی باتیں یاد آتی ہیں۔

اس وقت جب کہ چاروں طرف اتنا ہنگامہ ہے؟''۳۳؎

ذاکر کو بھی عین حالت ہنگام اپنا سابقہ وطن اور اس سے وابستہ واقعات شدت سے یاد آتے ہیں۔ آخر یادوں کی اتنی اہمیت کیوں ہے؟ اور یہ یادیں ایسے ناگفتہ حالات میں اتنی شدت کیوں اختیار کر لیتی ہیں؟

حالات کی ابتری سب سے زیادہ انسانی باطن پر اثر انداز ہوتی ہے اور فرد کی سالمیت کو مجروح کرنے کے درپے ہو جاتی ہے۔ ایسے میں خود کو اکٹھا رکھنے کے لئے، اپنی ذات کی کلیت کو بچانے کے لئے اور وجود کو بامعنی بنائے رکھنے کیلئے ماضی اور اس کی یادیں دراصل اس تگ و دو سے عبارت ہیں جو تشخص کی تلاش اور شناخت کی بازیافت کے لئے ناگزیر ہو جاتی ہیں۔

''مگر کمال ہے وہ اپنے آپ پر حیران ہونے لگا۔ باہر جتنا ہنگامہ
بڑھتا جاتا ہے، میں اندر سمٹتا جاتا ہوں۔ کب کب کی یادیں آ رہی ہیں۔
اگلے پچھلے قصے، بھولی بسری یادیں۔ باتیں ایک کے ساتھ دوسری، دوسری
کے ساتھ تیسری، الجھی ہوئی، جیسے آدمی جنگل میں چل رہا ہو۔ میری
یادیں، میرا جنگل ہیں۔ آخر یہ جنگل شروع کہاں سے ہوتا ہے۔''۳۴؎

بستی کا مرکزی کردار ذاکر بھی اسی تگ و دو میں مصروف ہے۔ وہ اپنی ذات میں ہو رہے انتشار سے خوف زدہ ہے اور اس پر روک لگانا چاہتا ہے۔ وہ اپنے وجود کی تمام جہات کو اکٹھا اور ہم آہنگ دیکھنے کا متمنی ہے۔ اس لئے اس کی بستی (روپ نگر) اس کی یادوں میں ایک Crystal کی طرح منور ہے، ایک ایسی روشنی ہے جو اس کی حالیہ زندگی کو معنویت عطا کرتی ہے، اس کی ذات کی تکمیل کا وسیلہ بنتی ہے۔ روپ نگر اور اس سے وابستہ یادیں محض وقت گزاری کا شغل نہیں ہیں اور نہ ہی سطحی ماضی پرستی اور نوسٹالجیا ہیں بلکہ یہ اس نفسیاتی ضرورت کی غماز ہیں، جس کی رو سے ماضی شخصیت کی مکمل اکائی کا ایک حصہ لاینفک ہے اور یہ ماضی محض ذاکر کا ذاتی ماضی نہیں ہے بلکہ اس ماضی کے دائرہ کار میں مذہب، نسلی اثرات، دیو مالائی حکایتیں، داستانیں اور عقائد و توہمات سب آتے ہیں۔

ہجرت کے سبب ماضی کا ایک بڑا حصہ بالخصوص بچپن اور جوانی کے ابتدائی ایام تو سرحد کے اس طرف ہی

رہ گئے۔

''جیسے اس کا بچپن روپ نگر میں رہ گیا تھا۔ روپ نگر میں کیا کچھ
رہ گیا تھا۔'' ۳۵

گویا روپ نگر اس کی ذات کا مرکز ہے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح پہیئے کا ایک مرکز ہوتا ہے جہاں سکون اور قرار ہے جبکہ پہیے کے گھیرے پر گردش ہے، حرکت ہے، اضطراب ہے اور یہ ہجرت اس مرکز سے یعنی گھیرے کی جانب تھی یعنی سکون وقرار سے گردش، حرکت اور اضطراب کی جانب۔ ذاکر کی یادیں نہ صرف یہ کہ مرکز سے اس کے بُعد کو کم کرنے کا وسیلہ ہیں بلکہ ذات کی بازیافت سے بھی عبارت ہیں۔ اس کی ذات صرف زمانۂ حال میں ہی نہیں پھیلی ہوئی ہے بلکہ اس کا ایک مضبوط سرا اس کے ذاتی ماضی (روپ نگر، بستی) سے ہوتا ہوا اجتماعی ماضی (تاریخ، تہذیب، عقائد وتوہمات وغیرہ) تک جا پہنچتا ہے۔ خواہ ذاتی ماضی ہو یا اجتماعی، ہجرت کے بعد زیادہ بامعنی ہوجاتا ہے۔

''یار کتنی عجیب بات ہے کہ وہی ایک بستی اپنے ایک باسی کے
لئے کہ ہجرت کر گیا ہے، پہلے سے بڑھ کر بامعنی ہوگئی ہے کہ وہ اسے
خوابوں میں دیکھتا ہے۔ ہجرت نے روپ نگر کو کتنا بامعنی بنا دیا ہے۔'' ۳۶

ناول ''بستی'' محض یادوں کا ہی تو نام نہیں ہے۔ اس میں ہجرت سے پیدا شدہ دیگر حالات وواقعات کی بھی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔

انتظار حسین کا اپنی تخلیقات میں طریقہ رہا ہے کہ کسی بھی سیاسی واقعہ کو وہ بلا وجہ اور بغیر سوچے سمجھے نہیں پیش کر دیتے ہیں اور نہ ہی اتنے واشگاف انداز میں کہ وہ واقعہ ایک سیاسی تبصرہ بن جائے، جیسا اخبار ورسائل میں ہوتا ہے اور جیسا انداز بعض اردو ناول میں بھی اختیار کیا گیا۔ سیاسی واردات کا تذکرہ ان کے یہاں اس طرح سے ہوتا ہے کہ وہ واقعاتی سطح سے اوپر اٹھ کر ایک وسیع تر انسانی تجربہ بن جاتی ہے۔ اور جب تک سیاسی واقعہ ایک وسیع تجربہ نہ بن جائے، فکشن میں احسن طریقے سے نہیں سما سکتا، یہی وجہ ہے کہ 'بستی' میں ہجرت کے سیاسی اسباب

پرورق کے ورق نہیں سیاہ کیے گئے ہیں۔قبل تقسیم کی سیاست تقسیم ہند، فسادات اور ہجرت ۔ یہ سارے معاملات مندرجہ ذیل اقتباسات کے ذریعے فوراً سامنے آجائیں گے۔

اوّل: ''چلتے چلتے وہ میرٹھ دروازے پر آئے ۔آگے سیدھی راہ پر کھڑکی بازار تھا جو بند پڑا تھا اور بے چراغ تھا۔ یہ وہ راستہ تھا جو ہندوؤں کے محلوں میں جا نکلتا تھا۔ برابر میں ایک گلی چلی گئی تھی جو مسلمانوں کے محلوں میں جاتی تھی۔ اس دوراہے پر دونوں ٹھٹکے ، دونوں نے ایک دوسرے کو خاموش نظروں سے دیکھا اور الگ الگ رستے چل پڑے۔''۳۷

دوم: ''میں جب گھر سے چلا تھا میرے سارے بال سیاہ تھے۔ اس وقت میری عمر ہی کیا تھی؟ بیس اکیس کے پیٹھے میں تھا۔ جب پاکستان پہنچا اور نہانے کے بعد آئینہ دیکھا تو میرے سر کے سارے بال سفید ہو چکے تھے۔ یہ پاکستان میں میرا پہلا دن تھا۔ گھر سے کالے بالوں اور خاندان والوں کے ساتھ نکلا تھا، پاکستان پہنچا تو میرا سر سفید تھا اور میں اکیلا تھا۔''۳۸

اس سے زیادہ اجمال سے اس پوری صورتحال کو سمیٹنا شاید ممکن ہی نہیں تھا، پہلے اقتباس میں ذاکر اپنے کالج کے دوست سریندر کے ساتھ چھٹیوں میں میرٹھ سے ویال پور آیا ہوا ہے تب جبکہ ہندو مسلم فسادات زور پکڑ چکے تھے۔ دوسرے اقتباس میں ایک سفید سر والے کا بیان ہے جو پابندی سے 'شیراز' نامی چائے خانے میں آیا کرتا تھا، اسی چائے خانے میں جہاں ذاکر کی منڈلی جمال کرتی تھی۔ بہر حال یہ سوال تو ذہن میں آئے گا کہ جہاں ہندو مسلم نفاق نہیں تھا، وہاں کے لوگ کیوں ہجرت کرتے ہیں؟ انگریز کی ''پھوٹ ڈالو، حکومت کرو'' کی پالیسی سے قبل بھی افراد ہجرت کے لئے مجبور ہوئے تھے۔ ذاکر تاریخ کا پروفیسر ہے، اس کے لئے تو یہ اور بھی آسان تھا کہ سارا

الزام انگریزوں پر ڈال دیا اور خود بری الذمہ ہوگئے، لیکن 1971ء کی ہند پاک جنگ اور پاکستان کی شکست کے بعد ذاکر کی ذہنی رو ملاحظہ ہو:

''اور جب ہم نے تم سے یہ عہد لیا تھا کہ آپس میں خونریزی مت کرنا اور اپنوں کو اپنے ملک سے مت نکالنا۔ پھر تم نے اس کا اقرار کیا تھا اور تم اس کے گواہ ہو۔ پھر وہی ہوا کہ اپنوں کو قتل کرتے ہو اور اپنوں میں ایک گروہ کو ملک سے نکالتے ہو۔ قتل کیا، پھر قتل ہوئے، نکالا، پھر نکلے۔ اور پھر جب دہشتیں راہوں میں خیمہ زن ہوئیں اور گلیوں کے کواڑ بند ہوگئے اور گھروں سے چکی کی آواز آنی بند ہوگئی اور چولہے ٹھنڈے ہوگئے۔''۳۹

اگر تاریخ عالم کے اوراق کو پلٹا جائے تو کیا زیادہ تر ہجرتوں کے پیچھے انہیں اسباب کی کارفرمائی نہیں نظر آتی ہے؟

نئے ملک میں مہاجروں کو شروع میں کتنی پریشانیاں اٹھانی پڑتی ہیں۔ نفسیاتی سطح پر دیکھیں تو جدی پشتینی مٹی سے جدا ہونے کا قلق، راستے میں عزیز و اقارب کو کھودینے کا کرب، سماجی اعتبار سے غور کریں تو ایک گھر کی ضرورت، اجنبی لوگوں سے تعلقات استوار کرنے کی کوشش، اقتصادی نقطۂ نظر سے جائزہ لیں تو مناسب ذریعۂ رزق کی تلاش وغیرہ وغیرہ یہ سب کچھ اس ناول کے مہاجر کرداروں کے ساتھ بھی ہوا۔ ان سطور کو دیکھئے:

زندگی کی ضرورتیں کہ ہجرت میں مختصر ہوتے ہوتے تن ڈھانکنے اور پیٹ بھرنے تک محدود ہوگئی تھیں، اب بڑھ کر پھیل گئی تھیں اور بڑھتی پھیلتی چلی جارہی تھیں۔''۴۰

'بستی' میں مہاجروں کی اس صورت حال کا بھی ذکر ہے جب نئے ملک میں ان کے لئے سب سے بڑا مسئلہ کہیں سر چھپانے کا تھا۔ ایک ایک مکان میں کئی کئی مہاجر خاندان ٹھنسے رہتے تھے۔ پھر کلیم داخل کرکے مکان

اپنے اپنے نام الاٹ کرا لینے کی دوڑ شروع ہوئی۔جس کے نام مکان الاٹ ہوگیا اس نے اپنے کو خوش قسمت جانا اور اسی مکان میں رہ رہے دوسرے مکینوں کو گھر سے نکال دینا اپنا حق سمجھا۔ وہی مکان جس نے کسی وقت میں کئی کئی خاندانوں کو پناہ دی تھی، اب انہیں بے پناہ کردینے پر تل گیا۔ دل تنگ ہوگئے اور خودغرضی نے ڈیرا ڈال دیا۔ اور اگر کوئی خاندان نکلنے سے انکار کردیتا تو معاملہ تو تکار، گالی گلوچ، ہاتھ پائی سے ہوتا ہوا تھانے، کچہری تک جا پہنچتا۔ ایک بھرا پڑا گھر چھوڑ کر آئے ہوئے مہاجروں کے نزدیک اولین فرصت میں کسی مکان کی ملکیت ایک اہم نفسیاتی وسماجی ضرورت بن گئی تھی۔ مہاجروں کے قافلے میں بہت کم ایسے تھے جو یہ سوچ سکتے کہ 'وہ میرا گھر نہیں' کسی سکھ کا ہے۔لیکن یہ خبر انہیں بھی نہیں تھی جو گھر والے ہوگئے تھے اور انہیں بھی نہیں جو کسی گھر کے لئے سرگرداں تھے کہ:

''اے ہے آخر گھر اجاڑ کے وہ کہیں تو جائیں گے۔ جب آدمی
پہ زمین تنگ ہوجاتی ہے تو وہ بس نکل کھڑا ہوتا ہے۔ یہ تھوڑا ہی دیکھتا ہے
کہ کہاں جارہا ہے؟''
''مگر وہ زمین تو اس پہ پہلے ہی تنگ ہوچکی تھی۔''
''ہاں پہلے وہ زمین تنگ ہوئی تھی اب یہ زمین تنگ ہوگئی۔''[۱۴]

ہجرت کی وجہ سے ویسے خاندان سب سے زیادہ متاثر ہوئے جن کے کچھ افراد ہجرت کر گئے اور کچھ نے اپنے آبائی وطن میں ہی سکونت کو ترجیح دی۔1947ء اور اس کے بعد کی ہجرتوں نے منقسم خاندانوں کی ایک ایسی روایت ڈالی جس کا خمیازہ آج کی نسل بھگت رہی ہے۔ صابرہ جس نے ہندستان میں ہی رہ جانے کا فیصلہ کیا، اس کی والدہ اور بڑی بہن مع اپنے شوہر کے ڈھاکہ سدھارے۔ ڈھاکہ کی صورتحال دگرگوں ہے، مہاجروں پر عرصہ حیات تنگ ہے۔ ایسے میں صابرہ اپنی والدہ اور بہن کے لئے سخت پریشان ہے۔

''اس کے بعد سے اس نے میرے کمرے میں آنا شروع
کردیا۔ پابندی سے روز آتی، ڈھاکہ کے سارے اخباروں کا مطالعہ کرتی

اور چلی جاتی۔

''آپ کے باقی عزیز کہاں ہیں؟''ایک روز میں نے پوچھا۔

''کوئی کراچی میں ہے،کوئی لاہور میں،کوئی اسلام آباد میں'

''اور یہاں؟''

''یہاں تو اب کوئی نہیں ہے۔''

''یہاں صرف آپ ہیں؟''

''جی، میں ہندستان میں اکیلی ہوں۔''۴۲؎

بنگلہ دیش کی جنگ آزادی نے پاکستانی مہاجرین کے لئے نئے مسائل پیدا کردیئے۔ پہلے تو خاندان صرف ہندستان اور پاکستان میں بٹا تھا، اب اس کے تین ٹکڑے ہوگئے یعنی ہندستان ،مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان۔مغرب والوں کو مشرق میں رہ رہے اہل خاندان کو کوئی خیریت نہیں معلوم ہو پاتی۔اس پر مستزاد وہ خبریں اورافواہیں ہیں جو رات دن سکون کو غارت کیے رہتی ہیں۔جن خاندانوں کو ہجرت کا داغ اٹھائے ۲۵ رسال بھی نہیں ہوئے تھے وہ اپنے کو دوسری ہجرت کے لئے تیار نہیں پارہے تھے۔انہیں پتا تھا کہ برصغیر میں ایک ملک سے دوسرے ملک ہجرت کرنا کتنے جان جوکھم کا کام ہے اوراس عمل میں کتنی جانوں کی قربانیاں دینی پڑتی ہیں اور خاندان کیسے کیسے آلام ومصائب سے دوچار ہوتے ہیں۔ بنگلہ دیش کی جدوجہد آزادی، جو ہو چکا ہے پھر وہی ہوگا' سے عبارت ہے۔اس جدوجہداور ہندو پاک جنگ نے 1971ء میں پھر ہجرت کا ایک نیا سلسلہ شروع کردیا۔

''سو کوئی ہندستان کی راہ بستی بستی خاک چھانتا، چھپتا چھپاتا پہنچا۔کسی نے اس قریۂ بلا سے نکل نیپال کی راہ لی اور وہاں سے یہاں آنے کا ڈول ڈالا۔کوئی برما میں نکل گیا اور وہاں سے مصائب وآلام جھیلتا واپس ہوا۔ بہت سے ہندستان میں رنج اسیری کھینچ کر واپس ہوئے۔بس پھر تانتا لگ گیا۔''۴۳؎

تقسیم ہند کے بعد دُنیا کے نقشے پر آنے والے دو نئے ملکوں میں کشیدگی آئے روز بڑھتی جارہی تھی جس کے نتیجے میں تمام تر تعلقات منقطع ہوئے جارہے تھے حتیٰ کہ خط وکتابت بھی ممنوع کردی گئی۔اس کا براہِ راست اثر ہجرت سے بچھڑے عزیز و کارب کو ہوتا تھا۔اس دکھ اور کرب کا نشانہ بننے والے مہاجر ایک دوسرے کی خیر وعافیت معلوم کرنے سے قاصر تھے۔کچھ لوگ دوسرے ممالک کے ذریعے خطوط بھیجتے تھے۔ناول بستی کی ان سطور کو ملاحظہ فرمائے:

''صابرہ کو خط لکھوں؟ اب اتنے زمانے کے بعد؟ وہ پس وپیش میں پڑ گیا۔مگر اسے جلد ہی خیال آیا کہ میں خط لکھ کیسے سکتا ہوں؟

''امی! ہندستان کے ساتھ ڈاک تو بند ہے۔خط لکھا کیسے جا سکتا ہے؟''

''اے ہاں مجھے یہ تو خیال ہی نہیں رہا تھا۔'' رکیں۔ پھر بولیں ''ارے بیٹا! خط لکھنے والے لکھ ہی رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ لندن والوں کے ذریعے ہندستان سے خط وکتابت ہورہی ہے۔اے بیٹا! لندن میں تیرا کوئی دوست نہیں ہے؟ خط اُسے بھیج دے۔وہ وہاں سے ہندستان بھیج دے گا۔[۴۴]

فسادات کے نتیجے میں ہجرت پر ہوئے مجبور لوگ کسی طرح سے اپنے خاندانوں سے بچھڑے اور بے سروسامان بس جان بخشی کے لئے منتشر ہوگئے۔جس کو جہاں کی سوجھی وہاں کا رخ کیا اور در در کی ٹھوکریں اس کا مقدر بن گئی۔ناول بستی کے ایک مہاجر کردار کرامت کے بارے میں مصنف یوں لکھتے ہیں:

''اچھا! کیا پتہ چلا؟''

''ادھر سے ایک شخص آیا ہے۔کہتا ہے کہ اس نے کرامت کو بنکاک میں دیکھا ہے''

''بنکاک میں؟''

''شاہ صاحب! اس میں حیرانی کی کیا بات ہے؟ اس قیامت میں تو جس کے جدھر سینگ سمائے ادھر نکل گیا۔کتنے تو ہندستان میں چھپے چھپے پھر رہے ہیں۔کتنے ہندستان کی راہ نیپال پہنچ گئے۔ادھر مشرق کی سرحد پار کرکے بہت سے برما میں نکل گئے۔کوئی رنگون گیا، کوئی بنکاک پہنچا۔تو یہ شخص بتاتا ہے کہ وہ بنکاک ہوتا ہوا

آیا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات کرامت سے ہوئی ہے۔'' ۴۵؎

ہجرت کرنے والے کن کن مصائب وآلام سے ہوتے ہوئے کہیں ٹھکانے پر پونچھتے اور کسی جان پہچان والے خاندان کے ساتھ رہ کر اپنے عزیز واقارب کا پتہ لگانے میں منہمک ہوجاتے۔ ان کی اس آمد کو مصنف نے ناول میں اپنے الفاظ میں بیان کیا ہیں اور مہاجر آنے والے ہر فرد کو پہچان لینے کے بعد کس گرم جوشی سے استقبال کرتے اور دوسرے لوگوں کے احوال دریافت کرتے ہیں ناول کے ان سطور میں یہ سب بیان کیا گیا ہیں:

''کبھی اچانک دروازے پر دستک ہوتی۔ دروازہ کھلنے پر کبھی
سامان اور سواریوں سے لدا پھنڈا تانگہ کھڑا نظر آتا، کبھی اکیلا آدمی، بے
سروسامان، لباس سیلا کچیلا، سر میں گرداٹی ہوئی، شیو بڑھی ہوئی، پہلی نظر
میں صورت پہچاننے میں نہ آتی۔ جب پہچانی جاتی تو آنکھیں حیرت زدہ
ہوکر دیکھتیں،''ارے تم ہو!'' بے ساختہ بغل گیر ہونا سوال پہ سوال کرنا
''کیسے آئے؟ رستے میں خیریت رہی؟ باقی لوگ کہاں ہیں؟ کیا اکیلے
چلے تھے؟ سامان کہاں ہے؟''
''خیرت کیسی؟ ٹرین پر حملہ ہوگیا تھا''
''اللہ خیر کرے، پھر؟''
''بس اللہ نے خیر ہی کی، جان اور آبرو رکھ لی ورنہ کوئی کسر تو
نہیں رہ گئی تھی''
''اللہ تیرا شکر ہے، پھر باقی لوگ کہاں ہیں؟''
''والٹن کیمپ میں ہیں۔''
''میاں جب گھر موجود ہے تو کیمپ میں کیوں پڑے ہو؟'' ۴۶؎

انتظار حسین جن کو ہجرت کا ذاتی تجربہ تھا اور انھوں نے اپنے افسانوں ادب کو ان ہی کہانیوں سے زینت

بخشی ۔اپنے ناول ''بستی'' میں مہاجرین کوکٹی پتنگوں سے تعبیر کرتے ہوئے یوں کہتے ہیں:

''کہاں کہاں سے لوگ آئے تھے ۔جیسے پتنگیں کٹ کر آتی ہیں
اور کسی چھت پر گر پڑتی ہیں۔''۲۷

مہاجرین اور بچھڑے رشتوں کا ذکر کرتے ہوئے انتظار حسین ناول کے مرکزی کردار اور ہیروئن صابرہ کا ہندستان میں اکیلئے رہ جانے اور ان کے دکھ کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ صابرہ عید کے دن بھی خوشی نہیں مناتی ۔اسے اپنے خاندان اور عزیز و اقارب سے بچھڑ کر ہر چیز اور ہر خوشی پھیکی پھیکی سی معلوم ہوتی ہے ۔اپنوں سے بچھڑنے کا غم ان کے باطن میں گہرے زخم کی صورت میں تازہ ہے اور وہ ایک اُداس خاوش صورت بنی ہوئی ہے ۔ ہندستان میں صابرہ کی عید کا احوال ان سطور میں درج ہیں:

''ہاں وہ عید کا دن تھا ۔ میں نے دیکھا کہ صابرہ سٹوڈیو سے
نکل رہی ہے۔ میں اس روز اسے دیکھ کر تھوڑا حیران ہوا۔''ارے تم؟ تم
نے آج چھٹی نہیں کی؟''
''جی نہیں''مختصر جواب آیا۔
''تو پھر یہیں عید مناؤ اور ہماری خاطر کرو۔''
''ضرور، چلیے ہمارے کمرے میں''............

عید کے دن کون مسلمان دفتر میں ڈیوٹی دیتا ہے بلکہ دفتری بابو تو ان دنوں شہر میں نہیں ٹکتے ۔ایک دن پہلے ہی، وقت سے پہلے دفتر سے سٹک جاتے ہیں اور ٹکٹ کٹا کر سیدھے اپنی بستی پہنچتے ہیں۔اورلڑکیاں؟ لڑکیاں تو مردوں سے بڑھ کر عید مناتی ہیں۔ میں نے چائے پیتے پیتے پوچھ لیا:

''صابرہ! تم روپ نگر نہیں گئیں؟''
''روپ نگر؟''اس نے تعجب سے مجھے دیکھا''وہ کس لئے؟''
''آپ لوگوں کے یہاں رواج یہ ہے کہ لوگ عید پر پردیس

میں نہیں ٹکتے، گھر جا کر عید مناتے ہیں۔''

''میں شاید آپ کو اپنی خاندان صورتِ حال بتا چکی ہوں۔
روپ نگر میں اب ہمارا کوئی نہیں ہے۔''۴۸

ہجرت نے باپ کو بیٹے سے، ماں کو بیٹی سے دوست کو دوست سے جدا کر دیا اور خاندانی نظام کو درہم برہم کر دیا۔ اس طرح کے بچپن کے دو دوست سریندر اور ذاکر کو بھی ہجرت نے ہمیشہ کے لئے جدا کر دیا۔ ایک دوسرے کا پتہ خطوط سے لگاتے ہے۔ محبت کی ڈور سے بندھے ان رشتوں کو تقسیم اور ہجرت کی تلخ گھڑیوں نے تار تار کر دیا اور لوگ خط وکتابت کے ذریعے اپنی دوستی کو نبھاتے رہے۔ تعزیتی خطوط کے بیچ ہندستان سے آیا ہوا ایک خط۔ ارے یہ تو سریندر کا خط ہے۔ اس نے عجلت سے لفافہ چاک کیا۔

''یار ذاکر! میں نے اگر تمہارے پتروں کا جواب نہیں دیا تو اس
کا کارن یہ ہے کہ میں دیس میں نہیں تھا۔ لمبے سمے سے یورپ کے
دیسوں میں گھوم پھر رہا تھا۔ لوٹ کے آیا تو تمہارے پتر ملے۔''۴۹

لیکن مہاجروں کی زندگی میں ان سب سے بڑھ کر مصیبت ہندو پاک جنگ نے لائی۔ یادوں میں محفوظ وطن اور حالیہ وطن میں جنگ ہوجائے تو وابستگیوں اور وفاداریوں پر ہر کوئی سوالیہ نشان اٹھانے لگتا ہے، ارباب حکومت سے لے کر عوام تک۔ بے چارے مہاجر سلامت اور اجمل کی طرح ہر جگہ گلا پھاڑ پھاڑ کر یہ ثابت کرنے پر تلے رہتے ہیں کہ وہ رجعت پسند نہیں ہیں کہ پرانے وطن کی یادوں کو اپنے سینے سے چمٹائے رہیں بلکہ اس کے برعکس نیا وطن تو ان کی شریانوں میں، رگوں میں خون بن کر دوڑ رہا ہے اور سابقہ وطن تو ان کی یادوں سے بھی حرف غلط کی طرح مٹ چکا ہے۔ ایسے لوگ میرا پاکستان، میرا پاکستان چلاتے ہوئے نہیں تھکتے، اپنی وفاداریوں کا ہر جگہ اعلان کرنے سے نہیں چوکتے، لیکن ذاکر کیا کرے کہ:

''دنیا جیسا کہ جناب امیر نے فرمایا مہمان خانہ ہے۔ ہم اور
ہماری آرزوئیں اس میں مہمان ہیں۔ مہمانوں کا حق نہیں ہوا کرتا۔ زمین

جتنا مہمانوں کو نواز دے اس کا احسان ہے اور زمین کے ہم پہ بہت
احسانات ہیں۔ یہ چابیاں امانت ہیں۔ اس امانت کی حفاظت کرنا اور
چھوڑی ہوئی زمین کے احسانوں کو یاد رکھنا کہ یہی تمہاری سب سے بڑی
سعادت مندی ہوگی۔'' یہ کہتے کہتے ایک دم سانس اکھڑا گیا۔''۵۰

ذاکر اب ایک مخمصے میں گرفتار ہے کہ وہ اصل میں کون ہے؟ اس کی وفاداری کس مٹی سے ہونی چاہئے؟ اس کا خمیر کس مٹی سے گوندھا گیا ہے؟ جسے اس نے چھوڑ دیا یا جس نے اس کے لئے اپنی آغوش وا کردی۔ وہ دھیان میں لاتا ہے تو سابقہ زمین اپنی تمام تر جزئیات اور تفصیلات کے ساتھ اس کے تصور میں جگ مگ کر رہی ہے اور یہ بھی کہ نئی مٹی تمام تر چمک دمک کے ساتھ اسے رجھا رہی ہے۔ ہجرت کے بعد ایک مسئلہ پرانی اور نئی زمین اور ان کے احسانات کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کا بھی ہوتا ہے۔ ذاکر صرف اتنا ہی کر سکتا ہے کہ:

''میں اس شہر کے لئے اور کچھ نہیں کر سکتا، دعا کر سکتا ہوں،
سو کرتا ہوں۔ یہ میرے تصور میں آباد روپ نگر کے لئے بھی دعا ہے۔ کہ
اسے میں اب اس شہر سے الگ کر کے تصور میں نہیں لاسکتا۔ روپ نگر اور
یہ شہر میرے اندر گھل مل کر ایک بستی بن گئے ہیں۔''۵۱

پاکستان کے مقتدر حلقوں اور ان کی پیروی میں عوام نے بھی یہ طے کر لیا تھا کہ پاکستان کی سیاسی اور تہذیبی تاریخ ہندستان سے آنول کاٹ کر ہی مرتب کی جاسکتی ہے۔ بھلا ایسے ملک یا قوم کی کیا تاریخ ہو سکتی ہے جس کی طبعی عمر مشکل سے پچیس سال بھی نہ ہوئی ہو۔ ابھی تو اس کا حال بھی ڈھنگ سے ظہور پذیر نہیں ہو پایا ہے۔ اور وہ حال جو ماضی سے کٹ کر پروان چڑھے اپنے ساتھ خرابیاں اور تضادات تو لے کر آئے گا ہی۔ ایسے میں عوامی زندگی میں بدامنی، بے سمتی اور تشکیک تو راہ پائیں گے ہی۔ اپنی ذات سے بے اعتباری، شناخت کی گمشدگی، بے گانگی، اجنبیت، یہی وجہ ہے کہ پاکستانی معاشرے میں بیش تر مہاجروں کا طرۂ امتیاز بنتی جا رہی ہیں۔

''آدمی اپنی چال سے پہچانا جاتا ہے۔ ہر آدمی ہر مخلوق، مگر یہ تو

ایسے چل رہے ہیں جیسے اپنی پہچان کھو چکے ہوں۔اور میں؟ کہیں میں بھی
تو ایسے ہی نہیں چل رہا ہوں۔نہیں، اس نے قطعی انداز میں دل ہی دل
میں کہا اور پھر فوراً اپنی چال کا جائزہ لینے لگا ۔ میں ایسے تو نہیں چلا
کرتا تھا۔'' ۵۲؎

ناول کے آخری حصے میں علامتی انداز میں مہاجرین کے احوال کو ایک بیٹے اور باپ کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔باپ بیٹے کا یہ مکالمہ اصل میں مہاجرین کے درد کی عکاسی کرتا ہے۔مکالمہ ملاحظہ فرمائیں۔

''اے مرے بیٹے! تو نے بستیوں کو کیسا پایا؟''
''میرے باپ ، میں نے بستیوں کو بے آرام دیکھا۔مشرق
مغرب شمال جنوب میں شادمانی اور شانتی کے کھوج میں سب سمتوں میں
گیا ہر سمت میں میں نے آدم کے بیٹوں کو دکھی اور پریشان پایا۔'' ۵۳؎

ناول نگار پاکستان میں پھر وہی افراط وتفریط کی کیفیت دیکھتا ہے،جنگی بحران کے مارے ہوئے عوام میں بھگدڑ مچتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ڈھاکے سے بھی لوگ بھاگ بھاگ کر ہندستان اور پھر نیپال اور پھر پاکستان پہنچ رہے ہیں۔آخر یہ بھاگ دوڑ کب تک؟ لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ ڈھاکے یا پاکستان میں ۷۰،۷۱ کے زمانے میں جو کچھ ہوا وہ ایک طرف مسلمانوں کا دل دہلا دینے کے لئے کافی تھا تو دوسری طرف آنکھوں کو نور اور بصیرت کو تابندگی بھی اسی سے ملی۔کیونکہ یہاں تو ہم مذہب،ہم مسلک لوگوں نے ہی ایک دوسرے کو تہہ تیغ کیا۔ یہاں کلچر کو مقدم پایا گیا جس کی بنیاد پر سر دھڑ کی بازی لگائی گئی اور خون کی ہولی جم کر ہوئی۔دراصل کلچر کے بت نے ایمان کی دولت لوٹ لی۔یہ بت بھی ہوس پرستی کی دین تھا۔کربلائے معلیٰ میں اسی ہوس پرستی کے خلاف امام عالی مقام نے علمِ جہاد بلند کیا تھا۔یہ حق کی آواز تھی جسے اموی سامراجیوں نے دبانے کی قوت بھر کوشش کی لیکن یہ وہ آواز تھی جو نیزے پر بلند سر کے مینار سے گونجی......اور حق پرستوں کے دل میں گھر کر گئی۔

انتظار حسین نے بستی میں ملوکیت کے اسی جارحانہ میلان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کی کوشش

کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ پاکستان کے قیام کے بعد وہاں بالعموم آمرانہ اور ملوکانہ نظام ہی رہا جب کہ وہ ملک خداداد تھا اس لئے اسلامیہ جمہوریہ کا نفاذ ہونا چاہئے تھا جو نہیں ہوسکا اور اسی وجہ سے مشرقی اور مغربی پاکستان میں چپقلش بھی چلتی رہی اور بالآخر بنگلہ دیش کی صورت میں مشرقی پاکستان الگ ہوگیا، لیکن اس کا غم ناول نگار کو اتنا نہیں ستاتا جتنا غم اس بات کا کہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان دونوں خطوں میں مہاجرین نہ صرف ذلیل وخوار اور رسوائے روزگار ہوئے بلکہ بے شمار جانیں تلف ہوئیں جو بالعموم غریب الوطنوں اور ناداروں کی تھیں۔ یہ رنج ناول نگار کے سینے میں مظلومین کربلا کی یاد تازہ کردیتا ہے۔

انتظار حسین رقم طراز ہیں کہ:

''آدمی اتنا ہی کچھ نہیں ہوتا جتنا وہ نظر آتا ہے۔اس کے رشتے اس کے خارج سے زیادہ اس کے باطن میں پھیلے ہوئے ہیں اور معاشرتی حقیقت خودمختار حقیقت نہیں ہے۔ وہ بہت سی غائب اور حاضر حقیقتوں، گم شدہ اور نو آمدہ عوامل کے تال میل سے جنم لیتا ہے۔ زمانے دو نہیں تین ہیں بلکہ آپس میں اس طرح گتھی ہوئی ہیں کہ ان کی حد بندی نہیں کی جاسکتی۔آدمی حاضر میں سانس لیتا ہے کہ مگر اس کی جڑیں ماضی میں پھیلی ہوئی ہوتی ہیں۔''۵۴

اس موضوع پر اردو میں بہت سارے ناول لکھے گئے ہیں اور آج بھی لکھے جارہے ہیں لیکن انتظار حسین کے مخصوص بیانیہ اسلوب نے اس ناول کو جو اختصاص واعتبار عطا کیا ہے وہ خود انتظار حسین کا ہی حصہ ہے اور یہی چیز انہیں اردو فکشن میں خصوصی امتیاز وانفراد عطا کرتی ہے۔ ان کی فکری سرمایہ داری اور فنی رچاؤ کا ایک زمانہ معترف ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب یوں ہی نہیں ہے وہ انسانی، اخلاقی اقداری میراث کے نمائندے ہیں۔

(ج) ناول تذکرہ 1987ء کے حوالے سے

ناول تذکرہ 1987ء انتظار حسین کا تیسرا ناول ہے۔اس سے قبل ان کے دو ناول ''چاند گہن''اور ''بستی'' منظر عام پر آ چکے تھے۔ان ناولوں کی اشاعت سے قبل انھیں افسانہ نگار کی حیثیت سے شناخت مل چکی تھی مگر ناول ''بستی'' نے انہیں عہد جدید کے عظیم ناول نگاروں کی صف میں لا کھڑا کیا۔اس ناول کا نام ''تذکرہ'' مصنف نے اس لئے تجویز کیا ہے، کیونکہ اس ناول میں ہجرت کرنے والے ایک ایسے خاندان کے حالات وواقعات قلم بند کئے گئے ہے جس کے افراد عمر کے ایک مرحلے میں پہنچ کر اپنے خاندان کے حالات کو تذکرے کی صورت میں سپرد قلم کرتے ہیں۔ناول ''تذکرہ'' کے ابتدائی حصے سے لی گئی ان سطور کو دیکھئے:

''پتہ تو چلے کہ آخر اس خاندان میں ایسی کون سی صفت تھی کہ ہر نسل میں کوئی بزرگ قلم دوات لے کر بیٹھ جاتا............ کی انہماک کے ساتھ خاندانی حالات قلمبند کرتا اور پچھلے تذکرے کے ساتھ شامل کر کے اولاد کے لئے ایک قیمتی اثاثے............ دادا پردادا مال ومتاع چھوڑ کر بھی تو جاتے تھے۔مگر وصیت ناموں میں جتنی تاکید ان پلندوں کے بارے میں ہے اتنی جائداد کے بارے میں نہیں ہے۔''۵۵

وزیر آغا اپنے مضمون ''انتظار حسین کا تذکرہ'' میں یوں رقم طراز ہیں:

''انتظار حسین کا تذکرہ بہ یک وقت ناول بھی ہے اور ایک خاندان کی خودنوشت سوانح عمری بھی۔''۵۶

سوانح عمری یوں کہ ہر زمانے میں اس خاندان کے کسی نہ کسی رکن نے اپنی ساری نسلی داستان کو قلم بند کیا ہے۔ بقول مصنف:

''اب میری سمجھ میں آرہا تھا کہ کیوں میرے اجداد ایک عمر پر
پہنچ کر تذکرہ لکھنے بیٹھ جایا کرتے تھے۔''۵۷

انتظار حسین کے سابقہ ناولوں کی طرح ''تذکرہ'' میں بھی ہجرت کا تجربہ کلیدی تجربہ ہے۔ البتہ اس ناول میں ہجرت کی ایک نئی جہت کو موضوع بنایا گیا ہے یعنی مہاجروں کی زندگی میں گھر کی اہمیت وضرورت یوں تو اس ناول میں سیاسی گفتگو کچھ زیادہ واضح ہیں اور ساتھ ساتھ صنعتی تہذیب (یا بڑے شہروں کی تہذیب) اور اس سے پیدا شدہ تنہائی، کشمکش، بے سمتی وغیرہ کو بھی انتہائی مؤثر طریقے سے پیش کیا گیا ہے لیکن جیسا میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ ناول میں جاری وساری تجربہ ہجرت اور اس سے پیدا شدہ حالات وواقعات کا ہی ہے۔ جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے کہ اس ناول کا بیشتر حصہ تذکرے پر مشتمل ہے اور اس میں 'اخلاق' کے تذکرے کے ساتھ ساتھ اس کے خاندان کے بزرگوں کے بھی تذکرے شامل ہیں۔

ناول کا آغاز اخلاق کے دادا مشتاق علی ولد حکیم چراغ علی کے تذکرے سے ہوتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ تذکرہ ایک بار شروع ہونے کے بعد ختم ہو کر ہی دم لیتا ہے بلکہ ناول میں بیچ بیچ میں کہیں کہیں نمودار ہو کر پھر غائب ہو جاتا ہے۔ انہیں کے تذکرے کے ساتھ حکیم چراغ علی کا تذکرہ بھی ناول میں موجود ہے اور پنڈت گنگا دت مہجور کا تذکرہ کا تذکرہ بھی جو مشتاق علی کے یار غار تھے۔ انہیں تذکروں میں خاندان کے دیگر بزرگوں، رشتہ داروں کے اقوال وواقعات بھی رقم ہیں جن میں بے سروسامانی اور نقل مکانی کا تفصیلی بیان قدرِ مشترک کے طور پر ابھرتا ہے۔ اخلاق کو جب اپنی ہجرت بے معنی معلوم ہونے لگتی ہے، نئی سرزمین کی اجنبیت ستانے لگتی ہے، بچھڑا وطن، گاؤں اور گھر (چراغ حویلی) بے تحاشہ یاد آنے لگتے ہیں تو وہ اپنے آبا واجداد کے تذکروں اور ملفوظات کی ورق گردانی میں مصروف ہو جاتا ہے اور اسے یہ جان کر خاصی حیرت ہوتی ہے کہ دربدری صرف اکیلے اس کا مقدر نہیں ہے بلکہ اس کے خاندان میں تو ایک ملک سے دوسرے ملک، ایک شہر سے دوسرے شہر ہجرت کی دیرینہ روایت موجود ہے۔ اس

دیرینہ روایت کو حکیم چراغ علی نے اپنے تذکرے میں یوں بیان کیا:

''پدر عالی مقام نے .... پھر یوں گویا ہوئے کہ:

''اے فرزند دلبند، ہم اصلاً اصفہان نصف جہان کی مٹی ہیں۔ ہمارے جداعلیٰ خلد آشیاں احمد باللہ عزم وہمت کے پیکر تھے، جو دوسخا کا سمندر تھے۔ ان کا مسکن کہ بیت الابیض کہلاتا تھا اصفہان میں مرجع خلائق تھا۔''

اور وہاں سے ان کے اجڑنے کا سبب یوں قلم بند کیا:

''مگر تیموری غضب کی آندھی ایسی چلی کہ پھر اصفہان اجڑ گیا۔سیہ بختی نے بیت الابیض میں ڈیرا کیا۔ اب وہاں سناٹا تھا...... تب ہمارے عالی قدر جد نے بصد وقار اپنے گھوڑوں اور ہتھیاروں پر ایک نظر ڈالی۔ خالی ایک تلوار کمر سے باندھی اوراس اسپ باوفا پر سوار ہوئے .... زوجہ محترمہ کو پیچھے اور کمسن فرزند کو آگے بٹھایا۔ بیت الابیض کے درودیوار پر حسرت سے نظر کی اور نکل کھڑے ہوئے۔''

اور ہجرت کے بعد کتنی صحرانوردی کے بعد قزدیں کی زمین نے ان کے پاؤں پکڑ لیے۔

''جدّ عالی مرتبت کتنے دنوں خاک بسر پھرتے پھرے۔ صحراؤں کی خاک چھانی۔ جنگلوں کو کھوندا۔ رات کبھی کسی کھوہ میں گزاری، کبھی کسی جھاڑی تلے خاک کے بستر پر بسر کی۔ بیٹے پوتے پڑپوتے خوب پھلے پھولے۔ ان میں سب سے بڑھ کر ہمارے جد امجد حکیم علی شیر ریحان تھے کہ مسکن اس گھرانے کا اسی جناب ہی کے نام منسوب ہوا اور قصر ریحان کے نام سے قریب و دور مشہور ہوا۔''

حکیم عالی شیر ریحان کہ جالینوس ثانی کہلائے لیکن ہجرت سے اپنا دامن بچا پائے ۔قزدین کی زمین بھی ظلم سے بھر گئی ۔حاکم وقت کے ظلم سے خلق خدا پناہ مانگتی تھی ۔اس کے ظلم کی چکی اندھا دھند چلتی تھی کہ اپنے پرایے کو بھی نہیں دیکھتی ۔''جب ظلم اور قہر بڑھ جائے تو خلق خدا ادبدا کر اپنے اپنے گھروں کو الوداع کہتی ہے اور نئے قریہ نئ بستی ،نئ زمین کی تلاش میں نکل پڑتی ہے کیونکہ زمین خدا تنگ نیست ۔کہیں نہ کہیں یہ زمین اپنے باسیوں پر مہربان ہو ہی جاتی ہے اور پھر مہاجر وہاں ڈیرے ڈال دیتے ہیں اور سکھم کی طرح گڑنے کی خاطر امور دنیاداری میں تندہی سے لگ جاتے ہیں ۔لیکن زمین ہمیشہ محبوبہ کی آغوش کی طرح نرم اور ماں کی گود کی طرح کشادہ نہیں رہتی ہے ۔حکیم علی شیر ریحان نے قزدین کو خیر باد کہا اور جہاں آباد کی زمین کو مہربان پایا اور وہیں ٹک گئے ۔انہیں کی اولادوں میں سے حکیم گلستاں علی کہ مسیح دوراں کا مرتبہ رکھتے تھے ، گلستان محل ، تعمیر کروایا ، لیکن جہان آباد کی زمین بھی اپنے فرزندوں پر تنگ ہونے لگی تھی'' گلستان محل سچ مچ گلستان محل تھا۔مگر سب کچھ غدر میں غارت ہو گیا۔''غدر نے واقعی دہلی والوں کو ایک نئ آفت میں مبتلا کیا ۔درختوں پر جسم لٹکتے تھے ،اہل علم و دانش قتل کر دیئے جاتے تھے ۔اس مصیبت زدہ خاندان کو سمیٹ کر حکیم گل زباغ علی اس آفت زدہ شہر سے نکل گئے کہ جسے دنیا جہاں آباد کے نام سے جانتی تھی ۔اس مصیبت زدہ خاندان کو برن کی زمین راس آ گئی ۔

> ''داداجانی اب اس دیار میں رچ بس گئے ۔حویلی تعمیر کی ۔جب حویلی بن کر کھڑی ہوئی اور نام اور تاریخ تعمیر کا پتھر لگانے کا وقت آیا تو ابا جانی کو بلا کر فرمایا کہ فرزند ، ہمارا زمانہ جہان آباد تک تھا۔اب تمہارا زمانہ ہے ۔سنگ تعمیر تمہارے نام کا لگے گا ۔یوں حویلی کا نام چراغ حویلی رکھا گیا۔''۵۹

لیکن ان کی قسمت میں بھی سکون کا زمانہ قلیل تھا کہ 1947ء برصغیر کی سیاسی زندگی میں ایک نیا موڑ لے کر آیا ۔ ملک کی تقسیم کی ٹھہری ، ہندو مسلم فرقہ وارانہ فسادات نے فضا کو مکدر کیا ۔ مار کاٹ ، قتل وخون روزمرہ کا معمول ہوا۔ابن چراغ علی کے لفظوں میں :

''کل ہی کی بات ہے برخوردار مصداق علی خبر لے کر آئے آج
رات چراغ حویلی پر حملہ ہوگا۔ پھر برخوردات نے اپنی بندوق بھری اور
رات اس طرح بسر کی۔ادھر میری رات بھی آنکھوں میں کٹ گئی۔''۶۰

اور مصداق علی نے پاکستان کو چ کیا اور وہاں کی مٹی میں رچنے بسنے بھی نہیں پائے تھے کہ راہی اجل ہوئے اور اپنے بیٹے اخلاق کو اجنبی قریے میں رچنے بسنے کی جدوجہد کے لئے اکیلا چھوڑ گئے۔اس خاندان کی سرگزشت کئی صدیوں پر محیط ہے اور ہر صدی میں ہجرت اس کا مقدر ٹھہری۔ یہاں پر ایک سوال ذہن میں آتا ہے کہ اس ناول میں یکے بعد دیگرے اتنی ساری ہجرتوں کا ذکر کیوں ہے؟ کیا کسی ایک ہجرت کے ذکر سے کام نہیں چل جاتا؟

اگر غور کریں تو ان تمام ہجرتوں میں کچھ قدریں مشترک ہیں جو ایک مخصوص پیٹرن بناتی ہیں۔ایک بھری پری خوش حال آبادی، پھر اس آبادی میں ظلم واستبداد کا دور دورہ، مظلوم طبقہ ہجرت کے لئے مجبور، نئی زمین میں رچنے بسنے کے لئے سخت جدوجہد، رفتہ رفتہ ایک بھری پوری خوش حال آبادی کا قیام، پھر اس آبادی میں ظلم واستبداد کا زور۔اور اس طرح ہجرت کا منظر نامہ مکمل ہو جاتا ہے۔محض ایک ہجرت اور اس سے وابستہ پہلوؤں کے مطالعے سے ذہن صرف اس مخصوص ہجرت کے علل واسباب اور نتائج ومسائل میں ہی الجھ کر رہ جاتا ہے اور وہ بصیرت جسے انسانی آبادی نے ہجرت کے تجربے کے حوالے سے صدیوں میں حاصل کیا تھا، نظروں سے اوجھل ہی رہ جاتی ہے۔ ادب اگر بصیرت نہ فراہم کرے تو محض دستاویز ہے۔کبھی تاریخی، کبھی سماجی، کبھی اقتصادی۔

''اس خاندان کی تو تقدیر ہی یہ چلی آئی ہے کہ چند پیڑھیاں
امن چین کے ساتھ گزاریں، اس کے بعد اکھڑے اور دربدر خاک بسر
ہوئے، پھر کسی دور کے نگر میں جا کر ڈیرے ڈالے اور بہ آئین شائستہ اس
مٹی سے نباہ کیا۔مگر کیا مجال کہ آن میں کبھی فرق آنے دیا ہو۔ جب زمین
تنگ ہوئی سب ٹھاٹ چھوڑا اور دامن جھاڑ کر نکل کھڑے ہوئے۔''۶۱

انتظار حسین کے ناولوں کو سوانحی ناول کے زمرے میں رکھا جاسکتا ہے یہ الگ بات ہے کہ وہ خود کسی ناول میں بطور کردار موجود نہیں ہیں مگر پھر بھی کرداروں کے پس پردہ مصنف کے نظریات واضح طور پر نظر آتے ہیں۔اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مصنف نے اپنے دور کی سیاسی وسماجی حالات کو ایک خاص نقطہ نظر کے ذریعہ پیش کیا ہے۔ سماج ومعاشرے کو دیکھنے کا انتظار حسین کا اپنا نظریہ ہے۔تقسیم ہند، ہجرت کا کرب اور اپنی زمین کی یاد ان کے فن کے لازمی اجزا ہیں جس کی وجہ سے ان کے تمام ناولوں میں ایک جیسی کیفیت محسوس ہوتی ہے بلکہ کچھ نقادوں نے ان کے ناولوں کو ایک دوسرے کی توسیع قرار دیا ہے۔ناول ''تذکرہ'' کا اختصاص یہ ہے کہ بہ یک وقت یہ ناول بھی ہے اور ایک خاندان کی خودنوشت سوانح بھی۔ناول میں جگہ جگہ اجداد کے تذکروں نے اسے خودنوشت سوانح کے زمرے میں لا کھڑا کیا ہے وہیں مصنف نے اپنے زمانے کے واقعات وحادثات کو ایک مرکزی کردار کے حوالے سے پیش کرتے ہوئے ناول کے اجزائے ترکیبی میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔انتظار حسین کے اس ناول کا موضوع پاکستان کے سیاسی حالات اور ذہنی انتشار کی بنا پر ہونے والی پریشانیاں ہیں۔

انتظار حسین کے یہاں وقت کا دائروی تصور بروئے کار نظر آتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ وہ حال میں ہوئے واقعہ کا ماضی کے واقعات سے رشتہ استوار کر کے اسے ابدی بنا دیتے ہیں۔انہوں نے ایک انٹرویو میں اس ناول کے لکھنے کی وجہ بتاتے ہوئے کہا تھا کہ ''اس ناول کے لکھنے کا سبب چاروں طرف پھیلا ہوا آشوب تھا اور وہ پھانسی تھی جو ناول کے مرکزی کردار اخلاق کے گھر کے پیچھے دی گئی تھی۔'' وہ تین پھانسیاں دراصل زمانے سے ہوتی آرہی پھانسیوں کی ایک کڑی تھی جس نے مصنف کو متاثر کیا اور اٹھارہ سوستاون، مغلیہ عہد، جنگ آزادی اور ماضی میں گزری کئی پھانسیوں کی یادوں نے آشوب کا ماحول پیدا کر دیا جس کے نتیجے میں ناول ''تذکرہ'' وجود میں آیا۔ ''تذکرہ'' وسیع کینوس کا ناول ہے۔اس ناول میں جہاں حال اپنی تمام تر حقیقتوں کے ساتھ موجود ہے وہیں ماضی اپنی آب وتاب کے ساتھ نظر آتا ہے۔انتظار حسین کے بیش تر افسانوں اور ناولوں کی طرح اس ناول کا مرکزی موضوع بھی ہجرت ہے۔

''اس نگوڑی ہجری نے تو خون کے رشتے ختم کر دیے۔'' ۶۲

چنانچہ اس ناول میں ایسے شخص کی کہانی پیش کی گئی ہے جس کی جڑیں ہجرت کی وجہ سے اکھڑ چکی ہیں۔ ان ہی جڑوں کی تلاش میں خاندان کے بزرگوں کے تذکرے اس کی مدد کرتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ اس ناول کا نام ''تذکرہ رکھا گیا۔

''بستی'' کی طرح ''تذکرہ'' بھی افسوس اور ملال کی کیفیت پیدا کرتا ہے ۔ یہ وہی کیفیت ہے جو کسی محبوب چیز کے کھو جانے سے پیدا ہوتی ہے ۔ تقسیم ہند ایک بہت بڑے المیے کی صورت میں سامنے آیا اور ہر کسی کو اپنی محبوب مٹی سے بچھڑنے پر مجبور کر دیا۔ لوگ نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے گھر، اپنی مٹی سے جدا ہو گئے ۔ کچھ لوگوں نے ایک زمین سے دوسری زمین کے لئے ہجرت کی اور کچھ لوگ اپنی جگہ موجود رہے مگر ان کا ملک اب ان کا نہیں رہا بلکہ وہ نئے اور دوسرے ملک میں سانس لے رہے تھے ۔ ان کا ذہن پرانے ملک سے نئے ملک کے لئے سفر کر رہا تھا۔ اس فیصلے نے اس قدر دوری بنا دی کہ لوگ ناسٹلیجک ہو گئے اور اپنے وطن، زمین، مٹی کی یاد میں کھوئے کھوئے سے رہنے لگے ۔ ناول کے مرکزی کردار اخلاق کو' آشیانہ' بنا لینے کے باوجود چراغ حویلی کے کھو جانے کا ملال اور افسوس ہے ۔ مکان ''تذکرہ'' کا سب سے نمایاں موضوع ہے ۔ چھوٹا ہوا مکان، چراغ حویلی، متروکہ مکانات، کرائے کے مکان اور پھر' آشیانہ'۔ نئے مکان سے لگاؤ کے باوجود جیل کی ہم سائیگی اور ملک کی فضا میں سرایت کر گئی دہشت نے بے اطمینانی کی کیفیت پیدا کر دی ہے جنھوں نے لازمی طور پر ماضی کے دریچوں میں جھانکنے پر مجبور کر دیا۔ مکان ایک طرح سے پاکستان کے سلسلے میں الجھے ہوئے خیالات کی علامت بھی ہے۔

اس ناول کے پلاٹ کے لئے ایک طرف جہاں حال کی کہانی، ہجرت، بے سروسامانی، دربدر بھٹکنا، پھانسیاں جیسے کئی واقعات کا انتخاب کیا گیا ہے وہیں اصل قصے کے ساتھ ساتھ خاندان کے بزرگوں کو لکھے ہوئے تذکروں کے ذریعہ حال کا ماضی کے واقعات سے رشتہ استوار کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔ یہ تذکرے دراصل انتظار حسین کے عمیق تاریخی مطالعے کے آئینہ دار ہیں ۔ تذکرہ مشتاق علی، تذکرہ چراغ علی اور تذکرہ گنگا دت مہجور میں خاندان کے احوال کے ساتھ ساتھ ہندستان کی تاریخ کے مختلف اہم واقعات ناول میں بیان ہوئے ہیں ۔ گاندھی جی کی ستیہ گرہ، جلیانوالا باغ، چورا چوری حادثہ اور اس طرح کے کئی واقعات کا ذکر ان تذکروں میں ملتا ہے ۔ یہ

تذکرے خاندان کے بزرگوں اوراہل خاندان کے اوپر گزرے ہوئے واقعات وحادثات کی روداد بھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اخلاق کے بزرگ اپنے وصیت نامے میں جائداد سے زیادہ ان پلندوں کومحفوظ رکھنے کی تلقین کرتے تھے:

''آخر میرے دادا پر دادا مال ومتاع چھوڑ کر بھی جاتے تھے مگر
وصیت ناموں میں جتنی تاکیدان پلندوں کے بارے میں ہے اتنی جائیداد
کے بارمیں نہیں۔''۶۳؎

ہجرت کے بعد زندگی کے بکھراؤ کے ساتھ ساتھ خاندان بھی بکھر گئے تھے۔ ایک تناور درخت کی جڑیں اکھڑ گئی تھیں۔ یہ تذکرے اخلاق کو ان جڑوں کی تلاش میں مدد کرتے ہیں:

''جان پدر! یوں ہمارے اجداد اصفہان سے نکلے، قریہ قریہ
پھرے اور جہان آباد میں آکر ڈیرڈالے۔''۶۴؎

کمرشیلائزشن اس ناول میں ایک اہم مسئلہ کی صورت میں سامنے آیا ہے۔ برکت الٰہی (مکان مالک) کے درخت کٹوانے کے فیصلے سے اخلاق بہت پریشان ہوجاتا ہے۔ وہ فوراً مکان تبدیل کر لینے کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ راتوں رات وہ اپنا سامان یک جا کر کے صبح تڑکے درخت کٹنے سے قبل وہ اس گھر سے نکل جاتا ہے۔ اخلاق کو پیپل ،مولسری اور دوسرے درختوں سے لگاؤ ہے اس لئے وہ فی الفور اس غم سے نجات پانا چاہتا ہے مگر اس کے دماغ میں کمرشیلائزیشن کی وجہ سے آنے والی تمام پریشانیاں گھر کر گئی ہیں۔ 'آشیانہ' کے فروخت کے سلسلے میں جب پراپرٹی ڈیلر سے گفتگو ہورہی تھی اور پراپرٹی ڈیلر اخلاق کو بتاتا ہے کہ یہ علاقہ بھی کمرشیل ایریا میں آگیا ہے تو اخلاق سہم جاتا ہے:

''صاحب بات یہ ہے کہ یہ علاقہ کمرشیل ایریا میں آگیا ہے
بس سمجھو کہ فیصلہ ہوگیا ہے......''
''واقعی یہ جگہ کمرشیل ایریا میں آگئی ہے؟''
''بالکل صاحب! فیصلہ ہوچکا ہے۔ فائل اس وقت گورنر

صاحب کی میز پر ہے۔ایک دو دن میں ان کے دستخط ہو جائیں گے پھر
دیکھئے یہاں کیسا انقلاب آتا ہے۔''
''ہاں مگر اس علاقے کا سکون ختم ہو جائے گا۔''۶۵؎

مصنف نے آشیانہ، برجیاں، ممٹیاں درخت اور پرندے تمام چیزوں کو ماضی کی یادوں کا ایک ذریعہ بنایا ہے۔جب پودے لگ جاتے ہیں تو پرندے بھی اس پر سکونت اختیار کرنے لگتے ہیں اور دھیرے دھیرے اخلاق کے ساتھ اس کے ناشتے میں بھی شریک ہونے لگتے ہیں۔ اخلاق کو یہ بہت اچھا لگتا ہے۔ یہ پودے اور پرندے اخلاق کے لئے ماضی کی بازیافت کا ذریعہ ہیں۔ وہ جب پرندوں اور پودوں کے پاس ہوتا ہے تو اسے کسی چیز کی فکر لاحق نہیں ہوتی ہے یہاں تک کہ بینکوں اور قرض دینے والے دستوں کے مطالبوں کے باوجود وہ بے فکری سے ماضی میں گم ان کے پاس کھڑا رہتا ہے۔ یہ تمام مناظر حال کی زندگی کے انتشار اور خوش گوار ماضی کی بہترین علامت ہیں۔ انتظار حسین کے نزدیک معاشرہ صرف انسانوں سے نہیں بلکہ پیڑ پودے چرند پرند، جانور چوپائے الغرض تمام حیوانات و نباتات سے مل کر تکمیل ہوتا ہے۔انسان جیسے جیسے ترقیات کی دنیا میں داخل ہوا وہ اپنے قرب وجوار کی چیزوں سے دور ہوتا گیا۔ وہ وقت گزر گیا جب' آشیانہ' کے صحن میں لگے پودوں اور درختوں پر پرندے اتر کر اخلاق کے ناشتے میں شریک ہونے لگے۔اخلاق ان کو تو اس کے زیرے کھلانے لگا۔آنے والے پرندوں میں کئی طرح کے پرندے تھے مگر جب ان چڑیوں اور پرندوں میں کوا شامل ہوا تو اخلاق کو بہت برا لگا اور اس نے کوے کو دھتکار کر بھگانے کی کوشش کی۔مگر اسے خیال آیا کہ یہ بھی تو پرندہ ہی ہے۔

''مگر پھر مجھے خیال آیا کہ کوے کو خلاف میرے یہاں اتنا
تعصب کیوں ہے۔آخر یہ بھی تو پرندہ ہے اور وہ پرندہ ہے جسے گیتوں کی
برہن کا گا کہہ کر پکارتی ہے۔نام سے بھی کتنا فرق پڑ جاتا ہے۔کاگا کا نام
دھیان میں آتے ہی اس کے ساتھ میرا سلوک بدل گیا۔''۶۶؎

کوے سے اخلاق کی منافرت دراصل مہاجروں سے منافرت کی علامت ہے۔اگر سبھی پرندے ایک ہی

جیسے ہیں تو اخلاق کے ذہن میں کوّے کے لئے اتنا تعصب کیوں ہے ۔ وہیں دوسری طرف اس کا نام بدل دیا جائے تو وہ بہت پیارا لگنے لگتا ہے۔ تقسیم ہند کے بعد مہاجروں کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی سلوک ہوا۔ مہاجروں کو گری ہوئی نظروں سے دیکھا گیا اور وہ وہاں کے اصل باشندوں کی نفرتوں کے شکار ہوئے ۔

ماضی اور چراغ حویلی اخلاق کو بہت یاد آتے ہیں وہ حال کی زندگی سے پریشان ہے اور اس کا حل ماضی میں تلاش کرتا پھرتا ہے ۔ وہ آشیانہ تو تعمیر کر لیتا ہے مگر چراغ حویلی اور وہاں کی زندگی کو بھول نہیں پاتا۔ یہی کیفیت بوجان کی بھی ہے۔ وہ چراغ حویلی کی زندگی کی یادوں کے سہارے نئے نئے کرائے کے مکانوں میں Adjust کرنے کی کوشش کرتی ہے مگر بات بات پر چراغ حویلی کی خوش گوار یادوں کو مزے لے لے کر سناتی ہے۔ وہاں کے رہن سہن طور طریقے یہاں تک کہ پکوان کا بھی ذکر بہت حسرت کے ساتھ کرتی ہے۔ 'بوجان' اس ناول کا ایک اہم کردار ہے ماضی سے محبت کرتی ہے اور حال سے نفرت وہ گیس چولہا، پریشر کوکر اور موٹر کاروں کی جگہ لکڑی کے چولہوں، پرانے طرز کے برتنوں اور یکہ و تانگہ کو پسند کرتی ہے ۔ وہ ماضی کی یادوں کے سہارے حال میں زندہ ہے ۔ جس کے بارے میں مصنف اخلاق کی زبانی کہتا ہے:

''وہ تو اپنی ذات میں زمانوں کا سنگم تھیں کہ کتنے زمانے کہاں
کہاں سے آ کر یہاں ملتے اور خوش اسلوبی سے جدا ہو جاتے تھے۔''۶۷

'بو جان' ماضی کی یادوں کے ذریعہ حال کی بدحالی سے سمجھوتا کر لیتی ہیں ۔ کرائے کے مکانوں کی پریشانیاں اور بے سروسامانی کو وہ چراغ حویلی کی خوش رنگ یادوں کے سہارے جھیل جاتی ہے ۔ ایسے میں جب اپنا گھر 'آشیانہ' بن کر تیار ہوتا ہے تو میلاد کرانا، بالوشاہیاں بٹوانا، بیبیوں کو جمع کرنا، گھر کے رکھ رکھاؤ کا خیال کرنا اور وقت وقت پر بزرگوں کی طرح نصیحت کرنا، یہ ساری چیزیں اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ بوجان نے آشیانہ کو چراغ حویلی کا بدل قرار دے دیا ہے ۔ چنانچہ پھانسیوں کے واقعات کے بعد جب پراپرٹی ڈیلر ایک خریدار کو گھر دکھانے لاتا ہے تو بوجان کو چراغ حویلی کی طرح آشیانہ کے چھن جانے کا خوف پیدا ہو جاتا ہے ۔ بوجان کو ایک نئی ہجرت اور ماضی سے انقطاع کا ایک منظر دکھائی دینے لگتا ہے ۔ اس خدشے کے تحت کہ کہیں ان سے آشیانہ چھن نہ

جائے وہ پوری طرح آشیانہ پر مرتکز ہو جاتی ہے۔ چوں کہ وہ آشیانہ کو چراغ حویلی کا بدل سمجھتی ہے اس لئے بوجان خواب میں بھی چراغ حویلی ہی دیکھتی ہے جس کا ذکر انھوں نے ان لفظوں میں کیا ہے:

''آج کل چراغ حویلی خواب میں بہت آ رہی ہے۔ راج مزدور لگے ہوئے ہیں پھر جیسے صفائی ستھرائی ہو رہی ہے۔ راج مزدور لگے ہوئے ہیں پھر جیسے صفائی ستھرائی ہوگئی ہو۔ کیسی چمک رہی تھی ماشاء اللہ۔ مردانے کے صحن میں چھڑکاؤ پہ چھڑکاؤ۔ میں جیسے ماں سے کہہ رہی ہوں کہ بہشتی جی کتنی مشکیں انڈیلو گے۔ اس نے جیسے میری بات سنی ہی نہیں۔ مشک خالی کی اور پھر کوئیں پہ ڈول بھر بھر مشک میں اور پھر مشک سے صحن میں چھڑکاؤ۔ پھر جیسے میاں جان ہیں تخت پہ گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے ہیں۔ سفید براق کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ چہرے پہ ایسی رونق کہ کیا بتاؤں، مجھے دیکھ کر مسکرائے۔ کتنی شفقت سے کہا کہ بہوتم آ گئیں بس اتنے میں میری آنکھ کھل گئی۔'' ۶۷

بوجان کو آشیانہ کے کھو جانے کے خوف سے نہ صرف چراغ حویلی کی یاد ستانے لگتی ہے بلکہ ان کو خوابوں میں بھی وہیں کے مناظر دکھتے ہیں۔ وہ چراغ حویلی کی یادوں کے سہارے اپنی ماضی میں پھر سے داخل ہو جاتی ہے۔ اپنی آنکھوں کے سامنے آشیانے کے لٹنے کے خوف سے خاموش ہو جاتی ہے اور یہی خوف ان کی موت کی وجہ بھی بنتی ہے۔

زبیدہ آشیانے کے فروخت کے سلسلے میں بہت جلد بازی سے کام لینا چاہتی ہے۔ اخلاق آشیانہ کے بیچنے کے سلسلے میں تذبذب کا شکار ہے لیکن آشیانہ چراغ حویلی کا بدل ہے اور ہجرت کے وقت چراغ حویلی فروخت نہیں کی گئی تھی اس لئے بوجان کے انتقال کے بعد اخلاق نے بھی فیصلہ کر لیا کہ آشیانہ نہیں بکے گا۔ وہ اپنے خاندان کی اس روایت کو قائم رکھتا ہے جو صدیوں سے چلی آ رہی تھی جسے بوجان بھی قائم رکھنا چاہتی تھی۔

''زبیدہ میں ایک بات بتادوں'' اب میری زبان کھل گئی تھی۔
''اگر یہ مکان بیچا تو ہمارے خاندان میں مکان بیچنے کی یہ پہلی مثال ہوگی ہمارے والد صاحب نے چراغ حویلی کو فروخت نہیں کیا۔میاں جان جو منع کر گئے تھے۔بس تالا ڈال کر نکل کھڑے ہوئے اور یہاں آ کر بھی ہم نے اس کی بنیاد پر کوئی الاٹمنٹ نہیں کرائی۔''
''آشیانہ نہیں بکے گا'' میں نے قطعی لہجہ میں کہا اور فوراً اٹھ کر برآمدے میں آ گیا۔''۶۹

یہ دربدری مہاجرت کی زندگی کا خاصا ہوتی ہے۔ ہر گھر اپنے مکینوں کو ایک مرکزیت میں باندھے رہتا ہے بالکل کسی پہیئے کی دھری کی طرح مہاجروں کی زندگی سے گھر غائب ہو چکا ہوتا ہے،لیکن وہ گردش میں رہتے ہیں اور وہ بھی دھری کے بغیر۔ یہ احساس اخلاق کے یہاں بھی شدت اختیار کرتا جارہا تھا۔

''پھر میں نے سوچا کہ شاید بوجان ٹھیک ہی کہتی ہیں کہ قدم جمانے کے لئے زمین کا اپنا کوئی ٹکڑا ہونا چاہئے۔شاید میں بکھرا ہوا آدمی اسی وجہ سے ہوں کہ بکھرا ہوں۔قدم جمانے اور سر چھپانے کے لئے کوئی نہ کوئی جگہ مل جائے تو شاید اپنی زندگی میں بھی کوئی جماؤ پیدا ہو جائے۔ سو مکان بنانے کا خیال جس سے آگے وحشت ہوا کرتی تھی اب میرا مسئلہ بن گیا۔۶۹

اگر غور سے اس ناول کا مطالعہ کیا جائے تو اخلاق کا اصل مسئلہ ایک گھر کے حصول کا ہے اور ان گھروں کو یاد رکھنے کا جنہیں اس نے اور اس کے آباواجداد نے بہ حالت مجبوری خیر باد کہا تھا۔ وہ گھر جہاں سے اس کا خمیر اٹھا اور اس کا بچپن گزرا، وہ سارے گھر اس کی خاندانی تاریخ وروایت کے امین تھے۔ یہ سارے گھر تو اخلاق کے ہی گھر تھے، جہاں سے اسے ہمیشہ نکالا ملتا رہتا ہے۔ان گھروں کو یاد رکھنا مجبوری نہیں بلکہ ایک نفسیاتی اور عمرانی ضرورت

ہے تاکہ اسے پتا تو چلے کہ وہ کون ہے، کہاں سے شروع ہوتا ہے، اس کے بغیر میں کون کون سے عناصر گندھے ہوئے ہیں، اس کی ذات کل ملا کر کیا بنتی ہے؟ ہر آدمی کو اپنی زندگی میں، عمر کے کسی نہ کسی مرحلے میں، ان سوالات سے سابقہ پڑتا ہے۔ بعض اس سوال سے کترا جاتے ہیں اور حال کو ہی سب کچھ مان کر بظاہر مطمئن ہو جاتے ہیں لیکن بعض لوگوں کو یہ سوالات اپنے سحر میں جکڑ لیتے ہیں جن سے پہلو تہی ممکن نہیں۔

اپنے آبا واجداد کے تذکروں کے مطالعے سے اخلاق کو یہ علم ہوا کہ اس خاندان میں گھر سے بے گھر ہونے کی ایک قومی روایت موجود ہے لیکن ساتھ ساتھ اس کا تو ذکر ہے کہ اجڑنے کے بعد وہ لوگ اجنبی دیار میں نئے سرے سے بسے اور خوب پھلے پھولے اور نیا گھر تعمیر کرایا حالانکہ پچھلے گھروں کا قلق ان کے دلوں میں بدستور موجود رہا۔ اخلاق نے بھی پاکستان میں بہ ہزار خرابی ایک مکان بنالیا اور اسے 'آشیانہ' کا نام دے ڈالا حالانکہ 'چراغ حویلی' اور اس سے وابستہ یادیں اسے ہمیشہ ستاتی رہیں۔ صرف یادیں ستاتی ہیں تو کسی طور زندگی گزاری جا سکتی ہے لیکن اگر موجودہ زمین ستانے پر آجائے تو:

''ہر زمین ہر آدمی کو راس نہیں آتی۔ بعض زمینیں اکل کھری
ہوتی ہیں کہ اپنے کسی باسی کو بستے نہیں دیکھ سکتیں، اپنے اجاڑ پن میں خوش
رہتی ہیں۔ بعض زمینیں زود حس ہوتی ہیں کہ بسنے والوں سے طبیعت میں
کھا جانے کو ان پر کشادہ ہو کر انہیں نہال کر دیتی ہیں طبیعت میل نہ کھائے
تو ان پر تنگ ہوتی چلی جاتی ہیں۔ مگر یہ آگاہی تو بعد کی بات ہے۔''[۷۰]

ایسا ہی کچھ اخلاق کے ساتھ بھی شروع ہو گیا۔ 'آشیانہ' اس نے کتنی محنت و مشقت سے بنوایا تھا۔ کہاں کہاں سے قرضے لے کر اس کی تعمیر کروائی تھی لیکن حالات اسے بھی چھوڑنے پر مجبور کر رہے تھے۔ گھر کے پچھواڑے اگر جیل اور پھانسی گھر ہو جہاں کھلے میں پھانسیاں لگائی جاتی ہوں تو اندیشے، واہمے، وسوسے اور خوف و دہشت سے سابقہ پڑنا لازمی ٹھہرا۔ اخلاق کی بیوی زبیدہ ہر حال اس گھر کو بیچ کر کہیں اور گھر خریدنے یا بنانے کے لئے اتاؤلی ہو گئی۔ اس پر طرہ یہ کہ ایک پراپرٹی ڈیلر بھی 'آشیانہ' کے فروخت کے سلسلے میں اس کے گھر اور آفس کے

چکر لگانے لگا۔اخلاق کو یوں محسوس ہونے لگا کہ وہ جو بڑی مشکل سے اکٹھا ہونے لگا تھا پھر بکھرنے لگا ہے۔ چراغ حویلی کا داغ ہی اس کے دل پر کافی تھا تو کیا اب' آشیانہ' کا داغ بھی سینے پر ڈھونا پڑے گا۔اور یہ دو داغ ڈھونے کا وہ اپنے کو اہل نہیں پاتا ہے۔گھر سے بچھڑ جانا کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے اور گھر سے ہجرت سب سے تکلیف دہ ہجرت ہے۔

''اب ہم پیدا کہاں ہوتے ہیں، مرتے کہاں جا کر ہیں، جنازہ کس ڈھوڑھی سے نکلتا ہے۔آدمی اب ڈال سے ٹوٹا پتہ ہے کہ ہوا اسے اڑائے اڑائے پھرتی ہے۔ کہاں سے رولتی ہے کہاں جا کر ڈھیر کرتی ہے۔''۱ے

مہاجر کس طرح رنج وغم کی زندگی بسر کرتے ہیں اور اپنے آبائی وطن کو یاد کر کے کس طرح خون کے آنسوں روتے ہیں۔اس اقتباس کو ملاحظہ کیجئے:

''حیف صد حیف کہ زمانہ بدل گیا اور ذائقے رخصت ہوگئے۔ہم کتنے ذائقوں کے ماتم دار ہیں۔اب چراغ حویلی کے دستر خوان پر نہ پستے تال مکھانے کا سالن ہوتا ہے نہ کیوڑے زعفران سے مہکتا ہوا قورمہ، نہ سلطانی دال، نہ اٹھارہ ورقی پراٹھے۔''۲ے

وزیر آغا اپنے مضمون''انتظار حسین کا تذکرہ''میں یوں رقم طراز ہیں:

'تذکرہ' سیدھی لکیر پر نہیں چلتا۔اس میں جا بجا موڑ اور غلام گردشیں ہیں۔اس کے کردار لمحہ بھر کے لئے ایک ملک میں نظر آتے ہیں پھر دوسرے ملک میں، پھر تیسرے ملک بہت کم ناولوں میں ایسی شعبدہ گری دیکھنے کو ملتی ہے جیسی 'تذکرہ' میں کہ مصنف جب چاہتا ہے اپنے قاری کو ایک جگہ سے دوسری جگہ اور ایک زمانے سے دوسرے زمانے میں پہنچا دیا ہے۔۳ے

اس ناول کے خاتمے کے لئے ناول نگار نے آشوب زدہ ماحول کی فضا بنائی ہے جہاں بم دھماکے ہو رہے ہیں، لوگ مارے جا رہے ہیں، لوگوں کے دل میں دہشت بیٹھ گئی ہے اور افراتفری کا ماحول پیدا ہو گیا ہے۔ کسی بھی وقت کسی بھی آفس میں کوئی انجان فون آتا اور فوراً اس آفس میں بھگدڑ مچ جاتی۔ ناول نگار نے کامریڈ کی موت پر ایک سوالیہ نشان لگایا ہے وہیں ''بدرنگ بلی کے راستہ کاٹ کر نظروں سے اوجھل ہونے'' کے جملے سے اس کی موت پر کوئی شبہ بھی نہیں چھوڑا ہے۔ اختتام پر اخلاق بوجان کی طرح دونوں وقتوں کے ملنے کی فکر کرتا ہے اور گھر کی حفاظت کے لئے مولوی غلام رسول کے دیئے ہوئے چراغ کے نہ بجھنے کی فکر کرتا ہے۔ بزرگوں کی طرح دعا کرتا نظر آتا ہے جس طرح بوجان کیا کرتی تھی جو ظاہر کرتا ہے کہ خاندان کے بزرگوں کے گزر جانے کے بعد اب اخلاق ان کی جگہ لے چکا ہے۔ ناول کے اختتام میں ناول کے کرداروں کے ساتھ ناول نگار بھی پوچھتا نظر آتا ہے کہ:

''اس لمبی کالی رات کا کوئی انت ہے کہ نہیں۔ اجالا اور کنارہ
کہیں ہے کہ نہیں اور درخت؟ اللھم انی اسلک۔''[۴۷]

(د) ناول آگے سمندر ہے 1995/96 کے حوالے سے

ناول ''آگے سمندر ہے'' انتظار حسین کا چوتھا اور آخری ناول ہے۔ یہ ناول 1995/96 میں زیور اشاعت سے آراستہ ہوکر ادبی حلقوں میں جلوہ گر ہوا۔ دوسرے ناولوں کی طرح ہی اس ناول میں بھی موصوف کا غالب موضوع ہجرت، تقسیم ہند اور مہاجرین کی زبوحالی ہے۔ اس میں معاشرتی اور تہذیبی مسائل کا ذکر کیا گیا ہے۔ سیاسی نوعیت کے سوالات قائم کئے گئے ہیں۔ پاکستان کے اس وقت کے سیاسی رہنما ''ایوب خان'' نے کراچی میں سمندر کے کنارے ٹھکانے بنانے والے مہاجرین کو کہا تھا کہ ''آگے سمندر ہے'' یہ ناول موصوف نے اسی تناظر میں لکھا ہے۔ اس میں مہاجرین کے مسائل کا ذکر کیا گیا ہے۔ ماضی پرستی اس ناول پر بھی چھائی ہوئی ہے۔

ناول ''آگے سمندر ہے'' کا نام اس لئے رکھا ہے کہ یہ ناول سمندر کے کنارے واقع شہر کراچی میں جھگیوں میں بسنے والے مہاجرین کی کسم پرسی کے تعلق سے لکھا گیا ہے۔ جن کو وقت کے سیاسی رہنما محمد ایوب خان سمندر کے کنارے بسنے سے منع کرتے ہیں۔ اس ناول کی یہ سطر ملاحظہ فرمائے۔

''ماں باولے ہوئے ہو۔ سمندر کے کنارے بسے ہوئے شہر کی کہیں جڑیں ہوا کرتی ہیں۔ وہ تو پانی پہ ہوتا ہے'' ''ہنسنے کی بات نہیں ہے۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ یہ جو ایرا غیرا اپنے آپ کو کراچی والا بتانے لگتے ہیں ان پر مت جاؤ۔ اصلی کراچی والا وہ ہے جس نے جھگی میں بسر کی ہے۔''

جو پرانے کراچی والے ہیں تو وہ کراچی والے نہ ہوئے۔''

چار دن کراچی میں رہتے ہیں۔ پانچویں دن کراچی والے بن جاتے ہیں۔'' ۵ے

ناول 'آگے سمندر ہے' کا موضوع بالواسطہ طور پر تقسیم ہند ہی ہے جس میں تقسیم کے وقت ہندستان سے ہجرت کر کے پاکستان جا کر بسنے والے افراد، اشخاص اور خاندان کے مسائل، طرز معاشرت اور ان کے ذہنی

وجذباتی کوائف کا احاطہ کیا گیا ہے۔لیکن ان سب کی تہہ میں کلیدی تجربہ، ہجرت کا تجربہ ہے۔وہ تجربہ جسے انتظار حسین قلبی واردات کا درجہ دیتے ہیں۔''آگے سمندر ہے' میں 1947ء کی ہجرت کے حوالے سے وسیع تاریخی پس منظر میں انسانی ہجرت کے تجربے کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔اس ناول میں ہجرت کے خارجی مسائل اورنتائج پر زورصرف کرنے کے بجائے مصنف نے ہجرت کے باطنی اثرات اوراس کے داخلی عمل ونتائج کومرکزی اہمیت دی ہے۔اس ناول میں تاریخ کی دواور ہجرتوں کا بھی ذکر ہے۔اندلس کی ہجرت کوقدرے تفصیل سے پیش کیا گیا ہے جو اندلس کے ایک شہر سے دوسرے شہر تک کئی بارعمل میں آئی تھی۔قرطبہ کے حالات جب مخدوش ہوئے تو لوگ اشبیلیہ ہجرت کر گئے۔اشبیلیہ سے مالقہ اور پھرآخر کارغرناطہ۔اس کے علاوہ متھرا لوگوں کی دوارکا ہجرت کا بھی ذکر ہے حالانکہ اس کا ذکراس قدر تفصیل سے نہیں ملتا۔دراصل ان ہجرتوں کے حوالے سے تقسیم ہند کے نتیجے میں عمل میں آئی ہجرت کو سمجھنے کا عمل آسان نہیں بلکہ خاصا پیچیدہ کام ہے جبکہ زمین وزمان کے فاصلے حائل ہوں، جغرافیائی اورسیاسی حالات مختلف ہوں۔کیا ہم ہجرت کے تجربے یا کسی بھی تجربے کو زمین وزمان کے فاصلے کے باوجوداس کی تمام جہتوں کے ساتھ من وعن قبول کر سکتے ہیں۔غالباًنہیں! تو پھراس عرق ریزی کا فائدہ؟

تقسیم ہند کے وقت کی ہجرت سیاسی اورسماجی صورتحال کا نتیجہ تھی''دوقومی نظریہ'' کا جواز ہم نے تاریخ سے ہی ڈھونڈ نکالا اوراس جواز کودرست اور جائزٹھہرانے کے لئے ہمارے معاشرے کی سائیکی پہلے سے ہی موجود تھی۔ اس نظریے سے خواہ کتنا ہی اختلاف ہو، اسے کتنا ہی غیرفطری گردانا جائے لیکن یہ سچ ہے کہ اس کی بنیاد پر ہندستان کوتقسیم جیسے ناگوارعمل سے گزرنا پڑا۔قرۃ العین حیدر''آگ کا دریا''میں اس نظریے کی نفی کرتی ہیں لیکن اس سے حقیقت تونہیں بدلی جاسکتی ہے۔انتظارحسین تقسیم کوتاریخ کا فیصلہ یاوقت کا جبر یا جو کچھ بھی ہوسمجھ کر قبول کرتے ہیں۔اس لئے اس ناول میں دوقومی نظریے کی حمایت یا مخالفت میں کچھ نہیں ہے۔سوائے اس واقعے کہ جب جواد ہندستان اپنے رشتہ داروں سے ملنے جاتا ہے تو حیدرآباد میں اس کا پھوپھی زاد بھائی شکور دوقومی نظریے کا حوالہ دیتا ہے۔اگراس نظریے میں دم ہے تو بھی وہ صرف اس اکیلی ہجرت کا سبب بنا ہوگا۔اُس ہجرت کا کیا جواز پیش کیا جائے جومتھراوالوں نے 'دوارکا' کی جانب کی۔ہجرت کی واردات کومحض کسی ۲۵۔۲۰ سالہ نظریے کی روشنی میں نہیں

سمجھا جا سکتا ہے۔اس کے لئے لامحالہ ہمیں تاریخ، وقت کے جبر، افراد کے اجتماعی شعور ولاشعور سب کو سمجھنا ہوگا۔

متھرا سے ہجرت کر کے 'دوارکا' بس جانے والے گنیش سے اس کے دوست نریندر نے، جو کہ متھرا سے آیا تھا، ہجرت کی وجہ جاننی چاہی تو ظاہر ہے کہ گنیش کیا بتاتا۔ دونوں اپنے گرد شمبھو مہاراج کے پاس پہنچتے ہیں اور اس سوال کا جواب چاہتے ہیں:

''گورو مہاراج! گنیش نے رکتے رکتے کہا۔ وشا تو اب دوارکا کی بھی اچھی نہیں ہے اور نریندر نے مجھ سے ایک نرالا سوال پوچھ ڈالا ہے۔ پوچھتا ہے کہ ہمارے بڑوں نے کیا سوچ کے متھرا نگری کو چھوڑا تھا؟''۔ ''پیرو!'' شمبھو مہاراج بولے۔''سب کال کا چمتکار ہے۔ ہم تو اس کے آگے بے بس ہیں۔''

مالقہ کا ابن حبیب یوں کہتا ہے:

''تب ابن حبیب نے اپنے تئیں سنبھالا اور بعد تامل کے یوں گویا ہوا کہ ''اے میرے غم گسار، کہنے کو تو یہ خانہ برباد مالقہ سے اجڑ کر آیا ہے اور اس تیرے دیار میں بے گھر بے در پھرتا ہے۔ مگر واقعہ یوں ہے کہ خانہ بربادی کچھ اس سیاہ بخت کے لئے نیا واقعہ نہیں۔ نسلوں سے ہمارے قبیلہ کا مقدر چلی آتی ہے۔ جاننا چاہئے کہ یہ خانہ خراب اصل میں اس اجڑے دیار کی مٹی ہے جسے خلقت اشبیلیہ کے نام سے جانتی ہے۔''٦٧

اور غرناطہ کا عبداللہ اپنے اجداد کی قرطبہ سے ہجرت کو یوں بیان کرتا ہے:

''تب عبداللہ یوں گویا ہوا ''اے یار عزیز، تو اپنے جدی شہر اشبیلیہ کے لئے صحیح روتا ہے۔ بستی بستے بستے بستی ہے مگر جب اجڑنے پر آتی ہے تو دم کے دم میں اجڑ جاتی ہے جیسے میرے اجداد کا شہر قرطبہ

اجڑا‘‘ ۷۷؎

اور دلّی کی اچھی بی اور مرزا دلاور بیگ کے احوال:

’’ارے بھیا ہماری سنو‘ اچھی بی پولیس‘‘ سوئیوں والے محلّہ میں کھم کی طرح گڑے بیٹھے تھے اور اچانک ایسے اکھڑے کہ نہ گھر رہا نہ در رہا۔

مرزا صاحب نے ٹھنڈا سانس بھرا اور بولے’’ہاں بھئی بس یہ سمجھو کہ زمین اچانک تنگ ہوگئی۔ اس وقت ابا حضور کا یہ فرمانا یاد آیا کہ بیٹے جب دیکھو کہ زمین تنگ ہورہی ہے تو دامن جھاڑ کر کھڑے ہوجاؤ۔ سمجھ لو کہ وہاں کا پانی اب تمہارے لئے نہیں ہے۔ تو دلی کی زمین نے بہت نہال کیا۔ ہماری پشتوں کو سنگھوائے رکھا۔ مگر اب ہماری طرف سے اس کی آنکھ پہ میل آ گیا تھا۔ سو ہم نے اسے سلام کیا کہ فقیروں نے تیرے دامن میں بہت ڈیرا کیا اب تجھے ہماری صحبت ناگوار ہے تو یہ ڈیرا اٹھاتے ہیں اور چلتے ہیں۔ سو پھر ہم نے اس دیار کا رخ کیا۔‘‘ ۷۸؎

ان اقتباسات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ تمام ہجرتوں کے پیچھے کچھ قدریں مشترک ہوتی ہیں۔ ہر ہجرت کے بظاہر کچھ ہنگامی نوعیت کے سیاسی اور سماجی اسباب ہوسکتے ہیں لیکن جڑ کہیں اور پیوست ہوتی ہے۔ وقت کا جبر، انسانی تہذیب کا اجتماعی شعور اور آرکی ٹائپ سب مل کر ہجرت کے عوامل اور اسباب متعین کرتے ہیں۔ انسان شروع میں خانہ بدوش تھا۔ آج گھر یہاں ہے تو کل وہاں اور پرسوں کہیں اور اسی صورتحال میں صدہا صد سال گزرے تب کہیں جا کر اس نے تمدنی زندگی اختیار کی۔ یہ خانہ بدوشی کا رویہ نسل در نسل انسانی آبادی کی نفسیات میں منتقل ہوتا رہا یا یوں کہہ لیں کہ اس کے اجتماعی لاشعور کا حصہ بنتا رہا۔ مسلمانوں کا کلینڈر ہجرت کے واقعے سے ہی شروع ہوتا ہے۔ ان کی اجتماعی زندگی میں ہجرت بہت ہی اہمیت کی حامل ہے۔ اکثر ہا یہ قوم ہجرت کے بعد زیادہ

مضبوط اور مستحکم ہوکر ابھری ہے۔ مکہ کے حالات جب ناسازگار ہوئے تو حضرت محمد مع اپنے پیروکار مدینہ ہجرت کر گئے اور پھراس کے بعد ایک نئ قوت اور توانائی کے ساتھ اسلام کی تبلیغ اور ترویج میں لگ گئے اور کامیاب بھی ہوئے۔ مسلمانوں کی پوری تاریخ کو اٹھا کر دیکھا جائے تو اس میں بیشمار ہجرتوں کی داستانیں درج ہیں۔ خواہ وہ اپنی مرضی سے اختیار کی گئی ہو یا مجبوری کے تحت۔

''بن حبیب چپ ہوا پھر تامل کرکے افسردگی کے ساتھ بولا''اے میرے عزیز اب میں اپنے اجداد کے سنت میں اپنے قریے سے اجڑ کر نکلا ہوں اور تیرے شہر میں وارد ہوا ہوں اور میں اپنے اجداد سے بڑھ کر سیہ بخت ہوں۔''۹ے

ان میں سے بعض ہجرتیں مسلمانوں کے اجتماعی شعور کا حصہ ہیں اوران کی تاریخ کا اہم باب۔ لیکن تمام ہجرتیں کامیابی وکامرانی پر ہی انجام پذیر نہیں ہوتیں۔ ایسی صورت میں ہجرت کے تجربے کو ضائع کر دینے کا قلق مہاجروں کو کئی نسل تک رہتا ہے۔ عموماً ایسی ناکام ہجرتیں اپنے ساتھ مایوسی و بےچینی لاتی ہیں۔ اگر ہم مسلم قوم کی ہجرتوں کے ساتھ عالم انسانی کی تمام ہجرتوں کو شامل کرلیں تو ناکام ہجرتوں کے بارے میں یہ کلیہ قائم کرسکتے ہیں کہ ناکام ہجرتیں ہی دراصل اپنے ساتھ ہجرت کا کرب تمام جہات کے ساتھ لے آتی ہیں۔

ہجرت کے بعد سب سے زیادہ متروکہ وطن کی کون سے شئے یاد آتی ہے۔ ذہن میں آنے والے پہلے دو نام یوں ہوسکتے ہیں، زمین، مٹی۔ عمر کے ساتھ انسان کا زمین سے رشتہ پختہ ہوتا جاتا ہے۔ اس لئے کہ رشتے ناطے رشتہ داروں، ناطہ داروں کی موت کے ساتھ ہی ختم ہوجاتے ہیں لیکن زمین کا ساتھ تا حیات رہتا ہے اور یہ بھی پتہ ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد زمین کا ہی پیوند بننا ہے۔ یہ احساس انسان کے دل میں زمین کی محبت کی صورت میں پلتا رہتا ہے۔ اس لئے ہجرت کے بعد چھوڑی ہوئی زمین بہت ستاتی ہے۔ اپنی زمین کو چھوڑنے، اسے اجاڑنے کا خیال احساس گناہ کی طرح ضمیر اوراعصاب پر سوار رہتا ہے۔ نئے وطن میں رچنے بسنے میں جو دشواریاں پیش آتی ہیں دل کہتا ہے کہ یہ سب چھوڑی ہوئی زمین کی بدعا کی وجہ سے ہے۔ پیارے میاں جو کہ پاکستان چلے گئے تھے

ایک دفعہ ہندستان آئے تو ان پر یہ راز منکشف ہوا:

''پچھلے برس یہاں آیا تھا(پیارے میاں) کہنے لگا ، بڑی بھابھی آپ نے ایسی بددعا دی کہ میں ابھی تک بے ٹھکانہ ہوں۔ میں نے کہا کہ بھیا بددعا میں نے نہیں دی۔تمہاری زمین نے تمہیں بددعا دی ہے۔آباد زمین کو اجاڑ نا کوئی اچھی بات تو نہیں ہے پیارے میاں،زمین بھی کوستی ہے۔''۸۰

متھرا کے نریندر کے ذہن میں بھی اسی طرح کے سوالات کلبلا تے ہیں:

''پرمتر، یہ تو عجیب بات ہے۔مرغی اپنی جان سے گئی، کھانے والے کو سواد نہیں آیا۔متھرا بھی اجڑ گیا اور دوارکا بھی۔اب سکھ آنند میں نہیں۔''نریندر کا اور جھجکتے جھجکتے بولا''گنیش ایک بات پوچھوں؟''

''پوچھ''

''شری کرش مہاراج تو بہت بدھیمان ہیں، بہت گیانی ہیں۔ انہوں نے کیا سوچ کر متھرا چھوڑا تھا؟''

''نریندر تو نے میرے دل کا چور پکڑلیا۔ یہ پرشن تو مجھے بھی بے کل رکھتا ہے۔'' ......''شاید!'' نریندر رکتے رکتے بولا۔شاید انہوں نے اپنی جنم بھومی کو چھوڑ کر......شاید......

صاف صاف کیوں نہیں کہتا کہ اچھا نہیں کیا۔''۸۱

ابن حبیب اپنے یا جداد کا واقعہ یوں بیان کرتا ہے جو اشبیلیہ سے ہجرت کر کے مالقہ میں سکونت پذیر ہوئے تھے۔

''پھر اس نے اس(گھر) کے صحن میں ایک کھجور کا پیڑ لگایا

اوراس کے سائے تلے ایک تخت بچھایا جس پر بیٹھ کر وہ صبح وشام گریہ کیا کرتا تھا۔ میں نے سنا اپنے جد سے کہ روز صبح وشام وہ اشبیلیہ کے درو دیوار کا تذکرہ کرتا اور اس گمشدہ صحن میں لگی کھجور کو یاد کرتا جو اس کی دانست میں کھجوروں کی شہزادی تھی اور پھر گریہ کرتا۔'' ۸۲؎

نئی زمین کا رویہ اگر مہربان ہو تو احساس گناہ کا بوجھ ضمیر پر کم ہوتا ہے اور یہ دلیل ضمیر کو وقتی طور پر مطمئن کردیتی ہے کہ ہجرت کرنے نہ کرنے میں اپنا اختیار کہاں تھا۔ وہاں کے حالات، وقت کے جبر نے ہجرت کے لئے مجبور کیا، لیکن زمین کو چھوڑنے، اسے اجاڑنے کا احساس گناہ تب شدید ہوجاتا ہے اگر نئی زمین نامہربان ہوجائے اور انسان کو خوار کرنے پر تل جائے۔ مرزا دلاور بیگ اس احساس کو ایک مجذوب کے قصے کے پردے میں پیش کرتے ہیں جس نے جب ایک شہر میں قدم رکھا تھا تو سونا تھا لیکن رفتہ رفتہ چاندی میں تبدیل ہوگیا۔ اسے اپنی خواری کا احساس ہونے لگا، اپنے مرشد کی خدمت میں حاضر ہوکر شہر چھوڑنے کی اجازت چاہی جو اسے مل بھی گئی، لیکن جیسے ہی اس نے شہر سے قدم باہر نکالنا چاہا زمین نے قدم پکڑ لیے کہ مرشد کا حکم ابھی اس تک نہیں پہنچا ہے۔ وہ مجذوب مسلسل ۲۵/سال سے روز گٹھری بغل میں داب کر شہر چھوڑنے کی نیت سے باہر قدم نکالنا چاہتا ہے اور زمین روز اس کے قدم پکڑ لیتی ہے۔ وقت کے جبر کے آگے کس کا زور چلتا ہے، ہم جانتے ہیں کہ فلاں افعال واشغال کی وجہ سے خواری نصیب ہورہی ہے لیکن اس کے بعد بھی انہیں ہی اختیار کرنے پر مجبور ہیں۔ مجذوب اس صورت حال پر اپنے کرب اور بے چینی کا اظہار یوں کرتا ہے:

'' پتہ نہیں کب حکم آئے گا اور کب زمین شہر چھوڑنے کی اجازت دے گی۔ میں نے جب اس شہر میں قدم رکھا تھا تو سونا تھا۔ اب اتنے عرصے میں چاندی بن چکا ہوں۔ چندے اور یہاں رہا تو کیا بن جاؤں۔'' ۸۳؎

بالکل یہی حال نریندر کا ہے جو شہر ناپرساں دوارکا سے نکل جانا چاہتا ہے لیکن:

گورومہاراج نے پھر گھور کر نریندر کو دیکھا''ہے متھرا نگر کے باسی تو یاں پہ کیا کر رہا ہے ۔ جا تا کیوں نہیں۔''

''گورومہاراج یہ نگر مجھے جانے نہیں دیتا۔''

''کیا کہتا ہے''

''میں روز بھورئے اپنی گٹھری بغل میں داب نکلتا ہوں۔
پر جب نگر سے پاؤں باہر نکالنے لگتا ہوں تو سامنے کھڑے
پیپل کی پھننگ سے ایک نیل کنٹھ پھڑ پھڑا کے اڑتا ہے اور میرا راستہ
کاٹ جاتا ہے۔ میں وہیں سے لوٹ آتا ہوں۔''۸۴؎

مرزا دلاور بیگ، اس مجذوب فقیر اور نریندر کے درمیان زبردست زمانی و مکانی فاصلہ حائل ہے لیکن تینوں ایک ہی کرب سے گزر رہے ہیں۔ کال کی چکی میں پس رہے ہیں۔ وقت کی جبریت کا شکار ہیں۔ مجبور محض ہیں اور اسٹیج پر اپنا اپنا رول ادا کرنے کے لئے مجبور ہیں۔

کسی معاشرے کی تاریخ میں وہ وقت اندوہ ناک ہوتا ہے جب اس کے افراد سونا سے ٹھیکرا بن جائیں۔ انسان اپنا اصل جوہر کیسے گنواتا ہے، معروضی اعتبار سے بتانا انتہائی مشکل ہے۔ اس زوال میں کچھ اس کے اعمال وافعال کا دخل ہے تو کچھ حالات کا، کچھ نفسیات کا تو کچھ تاریخ کو دہرانے کی سائیکی کا۔ جب کسی سماج کے حالات بگڑنے لگتے ہیں جس میں ملک کی سیاسی، سماجی صورت حال کو خاص دخل ہوتا ہے تو عموماً سب سے پہلے سماج میں تشدد راہ پاتا ہے۔ تمام مسائل کو تشدد یا قوت کے استعمال سے حل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور پاکستان میں تو اس کے قیام کے بعد سے ہی یہ رجحان غالب رہا ہے۔ مار کاٹ اور تشدد مسائل کا حل تو خیر کیا کر پاتے ہیں بلکہ معاشرے کو نئے مسائل، تکلیف دہ صورتحال سے دوچار کر دیتے ہیں۔ جس کی وجہ سے خوف و دہشت اور عدم تحفظ کا احساس ماحول پر طاری ہو جاتا ہے اور تب پاکستان کیا اور دوارکا اور غرناطہ کیا، سب زمان و مکان کی قیود و حدود سے نکل کر انسانی المیے کی ایک ہی داستان کا جزو دکھائی دیتے ہیں۔ جواد سے چائے خانے میں ایک شخص پوچھ بیٹھتا

ہے۔

''آپ صحیح کہتے ہیں، کسی شریف آدمی کو ان خبروں سے کیا دلچسپی ہوسکتی ہے۔ قتل، اغوا، زنا، فائرنگ، بم بلاسٹ جیسے شہر میں اس کے سوا کوئی سرگرمی ہے ہی نہیں۔ کم از کم اخبار تو یہی ثابت کرتے ہیں مجال ہے کوئی کام کی خبر ہو۔ بس انہیں دہشت خیز وارداتوں سے اخبار بھرا ہوتا ہے۔ آخر کہیں سے کوئی اچھی خبر بھی تو آنی چاہئے۔ ۸۵؎

لیکن کیا یہ صرف کراچی کا ہی مقدر ہے۔ دوارکا کے لوگوں کے ساتھ کیا ہوا تھا اور غرناطہ کے لوگوں کے ساتھ۔ گنیشن اپنے دوست کو دوارکا کی سیر یوں کراتا ہے۔

''سکھ کے دن بیت گئے۔ اب ہم سنکٹ میں ہیں۔ دوارکا میں اس سمے اندھکار مچا ہے۔ گلیوں، بازاروں میں سرکٹے گھومتے ہیں۔ بکریاں بھونکتی ہیں، گائیں رینگتی ہیں۔ مندروں سے گیدڑ کی چیخیں سنائی دیتی ہیں۔ ہون ستھانوں میں سوئر بیٹھے اور چوہے دوڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ ۸۶؎

ابن حبیب کے لئے غرناطہ خوف کا شہر بنتا جارہا ہے اور اس کے کانوں میں اکثر کسی پرندے کے پروں کی نامبارک سی پھڑ پھڑاہٹ سنائی دیتی ہے۔

''ابن حبیب نے تامل کیا پھر بولا'' ارے یار، اب تو آئے دن ہی میں اس شہر میں ایسا کچھ دیکھتا ہوں کہ میری پراگندہ خاطری بڑھ جاتی ہے اور دل میں سوطرح کے اندیشے گزرتے ہیں۔ میں زمانے کے الٹ پھیر کو دیکھتا ہوں اور حیران ہوتا ہوں کہ یہ تیرا شہر ایک وقت میں میرے لئے آغوش مادر تھا۔ اب خوف کا سمندر ہے۔'' ۸۷؎

اور جب نئے ملک کے حالات ایسے ہوجائیں تو یہیں سے ہجرت کے کرب کا آغاز ہوتا ہے۔ جب تک نئے ملک کے حالات سازگار تھے تب تک کوئی کرب نہیں تھا۔صرف چھوڑے ہوئے وطن کی یادیں تھیں۔ ایک نوسٹالجیا کی کیفیت تھی۔ چھوڑے ہوئے ملک کو جذباتی انداز میں یاد کر لینے کا عمل تھا، لیکن جب صورت حال اس قدر مخدوش ہوجاتی ہے تو معاشرے کا ہر فرد اپنے کو کچھ نہ کچھ اس کا ذمہ دار ضرور تصور کرتا ہے اور یہ کرب کا باعث ہے۔مہاجروں کے لئے دوہری مصیبت ہوتی ہے۔ایک تو اپنے فرائض سے عہدہ برآ نہ ہونے کا کرب دوسرے اپنی ہجرت کی منطق وجواز کے لغو ہونے کا کرب۔کرب کا یہ احساس کئی سطحوں پر اپنے اثرات مرتب کرتا ہے۔ ذات کا انتشار، تشخص وشناخت کا مسئلہ، مایوسی، احساس بیگانگی، اور خواہش مرگ وغیرہ۔معاشرے کے ناگفتہ بہ حالات، خوف ودہشت کا ماحول، عدم تحفظ کا احساس، ہجرت کا کرب یہ سب مل کر فرد کی ذات کو انتشار میں مبتلا کردیتے ہیں مستقبل سے اچھی توقعات ختم ہوجاتی ہیں۔اقدار واصول کی پامالی، زندگی میں سکون کی کمی، اپنی ذمہ داری کو نہ نبھانے کا خیال، اپنے منصب (آدمیت کے منصب) میں ناکامی کا احساس، یہ سب مل کر اپنی ذات پر سے یقین اٹھا دیتے ہیں۔ زندگی میں تشکیک کو راہ دیتے ہیں۔جس کے نتیجہ میں ذات کے بکھر جانے، گم ہوجانے کا احساس جڑ پکڑنے لگتا ہے۔

''یار مجھے لگتا ہے کہ جیسے ان میں کوئی چیز گم ہوگئی ہو''

مجو بھیا ہنسے'' کوئی چیز کی بات کرتے ہو استاد، یہ تو پورے کے پورے گم ہوگئے ہیں۔ ان کی تو کایا کلپ ہوچکی ہے۔ اب یہ نہ خالص کراچی والے ہیں۔

''اور جو یہ ہمارا لکھنؤ، ہماری دلّی کرتے رہتے ہیں۔''

''سب فراڈ۔مگر خیر انہیں معاف کردو۔ یہ فراڈ ان کی مجبوری ہے۔''

''مجبوری کیوں ہے؟''

''اس لئے کہ کراچی میں رہنے کے لئے آدمی کو کوئی نہ کوئی فراڈ
کرنا پڑتا ہے۔''۸۸؎

فراڈ کر کے دو ایک معاملات میں تو سرخرو ہوا جا سکتا ہے لیکن ساری زندگی فراڈ کے بل بوتے پر نہیں کاٹی جا سکتی، کسی نہ کسی وقت تو حقیقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ سامنا بھی زندگی کی کوئی راہ نہیں نکال پاتا، کوئی نصب العین نہیں فراہم کر سکتا۔

''بہت بڑی غلطی ہوگئی۔'' ٹھنڈا سانس بھرا۔''زندگی میں
ٹھوکریں لکھی تھیں۔ مرتے گرتے یہاں آئے۔ کراچی میں خراب ہو رہے
ہیں۔ اولاد امریکہ میں، ہم کراچی میں، دل شکار پور میں، روح کربلا میں۔
بس تذبذب میں ہوں جو بھیا۔''

''جی''

''سچ سچ بتاؤں میں تذبذب میں ہوں۔ بس شکار پور اور کربلا
کے درمیان لٹکا ہوا ہوں۔ مٹی اپنی طرف کھینچتی ہے ایمان اپنی طرف۔
روح کہتی ہے کہ اس اجڑی بستی میں کیا رکھا ہے۔ ادھر تو جنت کی کھڑکی
کھلی ہے۔ تو ایک طرف مٹی۔ دوسری طرف جنت کی کھڑکی سخت مشکل
میں ہوں۔ کربلائی صاحب چپ ہو گئے۔''۸۹؎

صرف کربلائی صاحب ہی تذبذب میں مبتلا نہیں ہیں۔ بلکہ ہجرت کرنے والی بیشتر آبادی اس گومگو کی کیفیت میں زندگی گزارتی ہے۔ یہ تذبذب گومگو کی کیفیت جب حد سے بڑھ جاتی ہے اور کوئی راہِ نجات نظر نہیں آتی تو احساسِ بیگانگی، مایوسی اور خواہش مرگ کا دور دورہ شروع ہو جاتا ہے۔

ابن حبیب بھی اشبیلیہ، جہاں کی وہ مٹی ہے، مالقہ، جہاں پر اس کی نال گڑی ہے اور غرناطہ، جہاں حالات کے ستم نے اسے لا پھینکا ہے، کے درمیان بری طرح سے دلا جا رہا ہے۔

''میرے سینے پر دو داغ ہیں۔ اشبیلیہ کا غم میرا جدی غم ہے۔ مالقہ کا غم میرا اپنا غم ہے، اشبیلیہ میں میرے اجداد کی قبریں ہیں۔ مالقہ میں میری نال گڑی ہے۔ سوائے میرے غم گسار، میرے مشفق، میں سینے پر دو داغ لیے تیرے شہر میں بھٹکتا پھرتا ہوں اور یہ جو میری چشم پر آب ہیں، یہ دونوں میرے لئے عذاب ہیں۔ ایک اشبیلیہ کے لئے اشک بار ہے دوسری مالقہ کے لئے روتی ہے۔'' ۹۰

اس کی مایوسی کا یہ عالم ہے۔

''پھر میں سو نہ سکا۔ وہ شاید پچھلا پہر تھا کہ تھوڑی دیر بعد اذان کی آواز سنائی دی۔ میں نے اٹھ کر وضو کیا، دوگانہ ادا کیا اور پھر دونوں ہاتھ بلند کر کے بصد زاری دعا کی کہ بارالہا، مجھے وہ دن دیکھنے سے محفوظ رکھ کہ میں اشبیلیہ جاؤں اور میری مٹی مجھے پہنچاننے میں تامل کرے اور میری گلیاں مجھے راہ دکھانے سے انکار کر دیں۔ پھر روتے روتے میری ہڑکی بندھ گئی۔'' ابن حبیب چپ ہو گیا۔ اس کی آنکھ بھر آئی تھی اور آواز رندھ گئی تھی۔ ۹۱

یہ مایوسی جب اس قدر بڑھ جائے کہ روشنی کی کوئی کرن نظر نہ آئے یا مستقبل میں اندھیرا ہی اندھیرا ہو تو بس ہاتھ پر ہاتھ دھرے موت کی خواہش اور اس کے انتظار کے سوا چارہ ہی کیا ہے۔ اور کم نصیبوں کو موت بھی کہاں اتنی آسانی سے آتی ہے۔ مرزا دلاور بیگ کی یہی خواہش ہے کہ 'میاں ہم مرنا چاہتے ہیں' لیکن ان کو یہ بھی احساس ہے کہ

''یہی تو مشکل ہے۔'' مرزا صاحب نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ ''مرنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ پتہ نہیں کاتب تقدیر نے ہمارے

نوشتے میں کیا لکھا ہے ۔ فی الحال نہ زندوں میں ہیں نہ مردوں میں ۔
میاں کل پرسوں کی بات ہے ۔ میں جواد میاں سے یہی شکوہ کر رہا تھا اور
بتانے جارہا تھا کہ آگے اللہ کے نیک بندے کس طرح نیت باندھ کر اس
دنیا سے سدھارتے تھے ۔''۹۲

دراصل شخصیت کی شکست وریخت کی اکیلی وجہ ہجرت ہی نہیں ہے ۔ جب کبھی زندگی کے سفر میں تھک کر ہم ذرا ستانے لگتے ہیں تو ہمیں بچپن کا زمانہ معصومیت کا عنوان لگتا ہے ۔ جب ہم باطنی اعتبار سے زیادہ معصوم تھے ، گناہوں اور خرابیوں میں ملوث نہ تھے ، انسان کی ازلی معصومیت کے نمائندہ تھے ، فطرت کے راز دار تھے ۔ وقت کے چکر نے اسے ضائع کر دیا یا خود ہم نے ، یہ سوال غیر اہم ہو جاتا ہے ۔ اہم صرف یہ رہتا ہے کہ ہم نے بہر حال اسے ضائع کر دیا ۔ یہی وجہ ہے کہ ہر انسان اپنی زندگی کے آخری زمانے میں اس معصوم عہد کو یاد کرتا ہے جو بچپن سے عبارت ہے ، لیکن مہاجروں کے ساتھ یہ معاملہ ذرا مختلف صورت اختیار کر جاتا ہے ۔ انہیں ہجرت کے قبل کی ساری زندگی ، اس سے وابستہ یادیں ، چھوٹے چھوٹے واقعات سب کچھ عہد طفلی کا حصہ معلوم ہونے لگتے ہیں ۔ جب کبھی موجودہ زمانے میں زندگی کرنا دشوار ہو جاتا ہے ، حالات انتہائی ناسازگار ہو جاتے ہیں تو پرانا وطن زیادہ شدت سے یاد آنے لگتا ہے ۔ جب دوارکا کے بُرے دن آئے تو پھر گنیش کو اپنی چھوڑی ہوئی نگری زیادہ ہی یاد آنے لگی ۔ ابن حبیب کو غرناطہ میں یہ احساس ہونے لگتا ہے وہ خرابے میں بھٹکتا پھر رہا ہے اور اشبیلیہ جسے وہ بھول چلا تھا پھر سے اس کے خوابوں میں واپس آجاتا ہے ۔ اسی طرح کراچی کی صورتحال سے نالاں اور اکتائے ہوئے مرزا صاحب کہتے ہیں:

''مگر بھائی رفتہ رفتہ ہم نے اس سمندری شہر میں بسر کرنا سیکھ لیا
ہے ۔ اب تم سوچ رہے ہوگے کہ مرزا گڑے مردے اکھاڑ رہا ہے ۔
بالکل ٹھیک سوچ رہے ہو ۔ ارے ہم نے تو مردے کو داب کے سو من مٹی
اس پر ڈال دی تھی ۔ سب کچھ بھلا کے یاں بیٹھے ہوئے تھے ۔ مگر اب

جانیں کیوں وہ باتیں یاد آرہی ہیں جیسے ابھی کل کی بات ہو۔''۹۳

جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ ماضی کو یاد کرنے کا معاملہ صرف مہاجروں کے ساتھ نہیں ہے بلکہ عموماً ہر آدمی اپنی ڈھلتی ہوئی عمر میں اس کا شکار ہوجاتا ہے۔اس کے پیچھے مختلف سماجی اور نفسیاتی عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔سماجی اعتبار سے احساس تنہائی اس کا سب سے بڑا محرک ہے۔آخری عمر میں Generation Gap اور زندگی کی ہنگامہ آرائی سے کنارہ کشی کے سبب تنہائی کا احساس بڑھ جاتا ہے۔ایسے میں کوئی ہم خیال اور ہم زبان نہ ہوتو ماضی کی یادیں پناہ گاہ بن جاتی ہیں۔نفسیاتی اعتبار سے دیکھیں تو ہر انسان اپنے لئے کچھ نصب العین مقرر کرتا ہے یعنی وہ کیا اور کیسا بننا چاہتا ہے؟مادی نصب العین اگر حاصل نہ ہوسکیں تو دکھ تو ہوتا ہے لیکن ناکامی کا احساس وقتی ہوتا ہے اور اس کی شدت بھی کم ہوتی ہے۔لیکن روحانی نصب العین میں ناکامی زندگی بھر دکھ اور پچھتاوا دیتی ہے۔کیا بننا چاہا اور کیا بن گئے،اس کا قلق شخصیت میں ناآہنگی اور تضاد پیدا کرتا ہے۔یہ ناآہنگی،جتنی زیادہ ہوگی انسان اسی قدر اضطراب اور بے چینی میں مبتلا ہوگا۔ایسے وقت میں ماضی یا بچپن اس لئے زیادہ یاد آتے ہیں تاکہ یہ دلاسا رہے کہ ہم ہمیشہ سے تو ایسے نہیں تھے،روحانی اعتبار سے اتنے خوار نہیں تھے۔کم از کم بچپن یا ماضی میں تو باطنی اور خارجی زندگی میں اس قدر تضاد نہیں تھا۔ایسا سوچنے سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ آدمی اپنی شخصیت کی شکست وریخت کی زیادہ تر ذمہ داری حالات اور ان کے تقاضوں پر ڈال کر اپنی شخصیت کی ناآہنگی میں خود اپنے رول کو کم سے کم کرلیتا ہے جو ایک حد تک اطمینان بخش ہوتا ہے۔دوسرا نکتہ یہ بھی ہے کہ ہم دوسرے کے سامنے اپنے بہترین روپ کو پیش کرنا چاہتے ہیں اور بچپن سے بہتر اور کوئی روپ نہیں۔لیکن مہاجروں کے ساتھ گھوم پھر کر وہی معاملہ آجاتا ہے کہ موجودہ ابتلا وخواری اور ابتذال کی اہم وجہ ہجرت کا فیصلہ تھا۔اس وجہ سے ہجرت سے پہلے کی زندگی کچھ زیادہ ہی یاد آتی ہے۔

مہاجروں کے یہاں قبل ہجرت کی یادیں دو طرح کے رجحان کو ظاہر کرتی ہیں۔ایک ماضی پرستی اور دوسرا نوستالجیا۔ماضی پرستی دراصل حال کی نفی کرکے ماضی میں جینے کا رویہ ہے۔یعنی حال میں خرابیاں ہی خرابیاں ہیں۔اس میں سوائے پریشانی اور رسوائیوں کے کچھ نہیں۔ماضی کی ساری چیزیں،ساری روایتیں،ساری علتیں اچھی

تھیں۔ ماضی پرست ماضی میں ہی جیتے ہیں جو دراصل فراریت کا رویہ ہے۔ اس ناول میں سید شبیر حسین کربلائی اسی رویے کے ترجمان ہیں۔ کراچی میں رہ رہے ہیں لیکن ذکر ہر وقت شکار پور کا رہتا ہے۔ سید آقا حسن بھی ماضی میں جینے والے انسان ہیں۔ ہر وقت لکھنؤ کی یاد میں مگن، دہشت گردوں پر لعنت بھیجتے ہیں لیکن سلطانہ ڈاکو کا ذکر مزے لے لے کر کرتے ہیں۔

یادوں کی دوسری صورت نوستالجیا ہے۔ نوستالجیا یعنی ماضی کو جذباتی وابستگی سے یاد کرنا۔ یہ دراصل حال کی تلخی سے وقتی نجات کا رویہ ہے۔ یہ حال سے فرار نہیں ہے بلکہ تلخی ایام کو کم کرنے کا وسیلہ ہے۔ ایک کامیاب اور مطمئن انسان بھی اپنے بچپن کو خلوص جذبات سے یاد کرتا ہے، یہ نوستالجیا ہے۔ شہر میں رہنے والا اس گاؤں کو یاد کرتا ہے جہاں وہ پیدا ہوا تھا اور جہاں اس نے زندگی کے ابتدائی ایام گزارے تھے۔ مہاجروں کا چھوڑے وطن، وہاں کی تہذیب وثقافت، چرند و پرند، شجر و حجر کو یاد کرنا دراصل نوستالجیا ہے جو ان کی جذباتی ضرورت ہے۔ نوستالجیا ایک صحت رجحان ہے اور حالات کا سامنا کرنے میں مخل نہیں ہوتا ہے۔ گنیش کے یہاں نوستالجیا کی کیفیت ملاحظہ کریں:

> گنیش کو متھرا نگری کے چھٹنے کا دکھ کھائے جارہا تھا۔ اس نگری کی گلیاں ہر آن ہر گھڑی اس کی آنکھوں میں پھرتی تھیں۔ مرلی کی آواز، وہ سوچتا ہے انہیں کیسا موہت کر دیتی تھی۔ گئیوں کے گلوں میں پڑی گھنٹیوں کی آوازیں اس کے کانوں میں گونجتی رہتیں۔ کتنا دودھ نکلتا تھا ان سے کہ گھر کی ساری مٹکیاں بھر جاتی تھیں اور روز گھر میں کھیر پکتی۔''۹۴

مرزا صاحب کی دلی بھی کچھ کم شاد و آباد نہیں تھی۔

''جو میاں، ہماری دلی بھی بہت شاد آباد بستی تھی۔''

''اے جو بھیا، اس کی تو میں بھی گواہی دونگی۔ ایسی امی جمی تھی کہ بس کیا بتاؤں۔''

''میاں، اکیلی جامع مسجد کی سیڑھیاں ایسی تھیں کہ وہاں کا ایک چکر لگالو اور عالم کی سیر کرلو۔ اس سے

آ گے چاوڑی تھی۔ بالا خانوں پہ یہاں سے وہاں تک چاند کے ٹکڑے۔'' ۹۵

قرطبہ کا ذکر عبداللہ کس جذبے سے کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

''کہ اس مبارک شہر میں جسے میرے جد نے عروس الاندلس
کے خطاب سے یاد کیا ہے کوچہ و بازار بے شمار تھے۔ ہر موڑ پر ایک حمام،
ہر کوچے میں ایک مسجد، مسجدوں کے بیچ مسجدوں کی ملکہ مسجد الاعظم کہ قرطبہ
کی پیشانی پہ جھومر کی مثال تھی۔ گرد اگرد اس کے رونق بے حساب تھی۔
کھوے سے کھوا چھلتا تھا، کٹورا بجتا تھا۔ اس سے پرے مدینتہ الزہرہ میں
صبح و شام نوبت بجتی تھی۔'' ۹۶

ان تین ہجرتوں اور ان کی تفصیلات کا آپس میں موازنہ کرنے کی کئی وجوہات ہیں:

(الف) تینوں ہجرت میں کئی چیزیں مشترک اور مماثل ہیں جو اس طرف اشارہ کرتی ہیں کہ ہجرت کا تجربہ عصری حالات سے متاثر ہونے کے باوجود زمان و مکان کی قیود سے پرے ہے۔ ہر مہاجر بعض معاملات میں بالکل ایک طرح کی سوچ رکھتا ہے اور ہجرت کا کرب ہر جگہ یکساں ہے۔

(ب) ہجرت کا تجربہ اور اس کا کرب نسل در نسل منتقل ہوتے رہتے ہیں اور یہ دراصل قوموں، گروہوں کے اجتماعی لاشعور کا جز ہیں۔ یہ اجتماعی لاشعور ہی ہے جو مخصوص حالات میں مخصوص رویوں کو جنم دیتا ہے۔ گنیش، ابن حبیب، جواد، ہجرت کو یکساں ذہنی و جذباتی طریقے سے محسوس کرتے ہیں۔ اجتماعی لاشعور کی وجہ سے قومیں اپنے آباد و اجداد کے ذہنی اور جذباتی رویوں کو سمجھ پاتی ہیں اور ان کی پیروی کرتی ہیں۔

(ج) اندلس کے لوگوں کی ایک علاقے سے دوسرے علاقے کی ہجرت ایک تاریخی حقیقت ہے۔ بھگوان کرشن کی 'متھرا' سے 'دوارکا' کی جانب ہجرت حالانکہ Myth ہے لیکن اس کی حیثیت برصغیر میں تاریخی حقیقت کی سی ہوگئی ہے۔ ان دونوں ہجرتوں کا ذکر ناول میں اس لئے بھی آیا ہے کہ پاکستان والے اپنی ہجرت کو وسیع تاریخی پس منظر میں سمجھ سکیں۔ آج پاکستان کی مہاجر آبادی جس صورتحال سے دوچار ہے اس کے علل و اسباب کا تجزیہ پچھلی

دوہجرتوں (بلکہ جتنی بھی ہجرتیں تاریخ میں ہوئی ہیں) کے حوالے سے کیا جانا چاہئے اوران غلطیوں کوسدھارا جائے جن سے پچھلی ہجرتوں میں تغافل برتا گیا تھا۔

(د)اس موازنے سے یہ خدشہ بھی ابھر کر سامنے آتا ہے کہ کہیں حالیہ ہجرت کا انجام بھی پہلی دوہجرتوں کی طرح نہ ہوجائے اورتاریخ اپنے آپ کو دہرانہ بیٹھے۔اندلس سمندر کے کنارے بسا تھا، دوارکا کے پاس سے ایک بڑادریا گزرتا تھا اور کراچی بھی سمندر کے کنارے بسا ہے۔کہیں ایسانہ ہوکہ مہاجروں کے لئے ان کی زمین تنگ ہوجائے اوران کے آگے صرف سمندراوراس کی غضب ناک لہریں ہوں۔

حوالہ جات

۱۔اردو ناول آزادی کے بعد،اسلم آزاد،ڈاکٹر ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس،دہلی،۲۰۲۰ء، (ص ۔ ۱۳۳)

۲۔انتظار حسین ایک دبستان، مرتب پروفیسر ارتضیٰ کریم، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی،۲۰۱۸ء، (ص ۔ ۴۰)

۳۔ایضاً (ص ۔ ۷۰)

۴۔ایضاً (ص ۔ ۲۶۱)

۵۔ایضاً (ص ۔ ۲۶۲)

۶۔بستی، انتظار حسین، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی،۲۰۱۱ء، (ص ۔ ۱۸۰)

۷۔چاند گہن، انتظار حسین، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی،۲۰۱۳ء (ص ۔ ۶)

۸۔ایضاً (ص ۔ ۹)

۹۔انتظار حسین ۔ حیات وفن، مرتب ڈاکٹر نعیم انیس، اضحیٰ پبلی کیشنز، کولکاتا،۲۰۱۷ء (ص ۔ ۳۰۳)

۱۰۔چاند گہن، انتظار حسین، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی،۲۰۱۳ء (ص ۔ ۱۷)

۱۱۔ایضاً (ص ۔ ۱۸)

۱۲۔انتظار حسین ۔حیات وفن ، مرتب ڈاکٹر نعیم انیس ، اضحیٰ پبلی کیشنز ، کولکاتا ، ۲۰۱۷ء (ص ۔ ۳۰۹)

۱۳۔ایضاً (ص ۔ ۳۱۰)

۱۴۔چاند گہن ، انتظار حسین ، عرشیہ پبلی کیشنز ، دہلی ، ۲۰۱۳ء (ص ۔ ۳۳)

۱۵۔ایضاً (ص ۔ ۶۹،۷۰)

۱۶۔۔ایضاً (ص ۔ ۸۸،۸۹)

۱۷۔ایضاً (ص ۔ ۹۵)

۱۸۔ایضاً (ص ۔ ۹۶،۹۷)

۱۹۔ایضاً (ص ۔ ۱۰۰)

۲۰۔ایضاً (ص ۔ ۱۱۰،۱۱۱)

۲۱۔ایضاً (ص ۔ ۱۱۵)

۲۲۔ایضاً (ص ۔ ۱۳۰،۱۳۱)

۲۳۔ایضاً (ص ۔ ۱۳۳)

۲۴۔ایضاً (ص ۔ ۱۴۹)

۲۵۔بستی ، انتظار حسین ، مکتبہ جامعہ ، دہلی ، ۲۰۱۱ء ، (ص ۔ ۱۴۸)

۲۶۔اردو ناول آزادی کے بعد ، ڈاکٹر اسلم آزاد ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس ، دہلی ۲۰۲۰ء ، (ص ۔ ۲۵۲)

۲۷۔ایضاً (ص ۔ ۲۵۳)

۲۸۔بستی، انتظار حسین، مکتبہ جامعہ، دہلی، ۲۰۱۱ء، (ص ۔ ۷۴)

۲۹۔ایضاً (ص ۔ ۳۴،۳۵)

۳۰۔ایضاً (ص ۔ ۱۲۳)

۳۱۔ایضاً (ص ۔ ۵۴،۵۵)

۳۲۔ایضاً (ص ۔ ۴۴)

۳۳۔ایضاً (ص ۔ ۵۲)

۳۴۔ایضاً (ص ۔ ۱۵)

۳۵۔ایضاً (ص ۔ ۳۴)

۳۶۔ایضاً (ص ۔ ۱۲۷)

۳۷۔ایضاً (ص ۔ ۴۶)

۳۸۔ایضاً (ص ۔ ۷۴)

۳۹۔ایضاً (ص ۔ ۱۸۰)

۴۰۔ایضاً (ص ۔ ۸۲)

۴۱۔ایضاً (ص ۔ ۱۸۸)

۴۲۔ایضاً (ص ۔ ۱۲۲)

۴۳۔ایضاً (ص ۔ ۱۹۱)

۴۴۔ایضاً (ص ۔ ۱۸۹)

۴۵۔ایضاً (ص ۔ ۱۸۵)

۴۶۔ایضاً (ص ۔ ۸۰)

۴۷۔ایضاً (ص ۔ ۱۱۴،۱۱۵)

۴۸۔ایضاً (ص ۔ ۱۲۵،۱۲۶)

۴۹۔ایضاً (ص ۔ ۲۰۲)

۵۰۔ایضاً (ص ۔ ۱۹۹)

۵۱۔ایضاً (ص ۔ ۱۴۸)

۵۲۔ایضاً (ص ۔ ۱۱۸)

۵۳۔ایضاً (ص ۔ ۲۲۱)

۵۴۔اردو ناول آزادی کے بعد، مرتب ڈاکٹر اسلم آزاد، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاس، دہلی ۲۰۲۰ء، (ص ۔ ۲۵۷)

۵۵۔تذکرہ، انتظار حسین، مکتبہ جامعہ، نئ دہلی، ۱۹۸۷ء، (ص ۔ ۱۱)

۵۶۔انتظار حسین کا تذکرہ، مشمول، انتظار حسین ایک دبستان، مرتب ارتضیٰ کریم، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاس، دہلی ۲۰۱۸ء، (ص ۔ ۵۲۰)

۵۷۔تذکرہ، انتظار حسین، مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر، دہلی ۱۹۸۷ء (ص ۲۶۷)

۵۸۔ایضاً (ص ۔ ۱۸۳،۱۸۴)

۵۹۔ایضاً (ص ۔ ۶۶)

۶۰۔ایضاً (ص ۔ ۲۷۳)

۶۱۔ایضاً (ص ۔ ۲۷۴)

۶۲۔ایضاً (ص ۔ ۲۰۸)

۶۳۔ایضاً (ص ۔ ۱۱)

۶۴۔ایضاً (ص ۔ ۱۸۶)

۶۵۔ایضاً (ص ۔ ۲۱۹)

۶۶۔ایضاً (ص ۔ ۱۱۰)

۶۷۔ایضاً (ص ۔ ۲۲۶)

۶۸۔ایضاً (ص ۔ ۲۸۷)

۶۹۔ایضاً (ص ۔ ۳۳)

۷۰۔ایضاً (ص ۔ ۴۶)

۷۱۔ایضاً (ص ۔ ۱۳)

۷۲۔ایضاً (ص ۔ ۷۷)

۷۳۔انتظار حسین کا تذکرہ،مشمولہ،انتظار حسین ایک دبستان،مرتب ارتضیٰ کریم،۲۰۱۸ء، (ص ۔ ۵۲۵)

۷۴۔تذکرہ،انتظار حسین،مکتبہ جامعہ،جامعہ نگر،دہلی،۱۹۸۷ء، (ص ۔ ۲۹۵)

۷۵۔آگے سمندر ہے،انتظار حسین،مکتبہ جامعہ،نئی دہلی،۲۰۱۱ء، (ص ۔ ۱۶،۱۵)

۷۶۔ایضاً (ص ۔ ۲۷۶،۱۹۹)

۷۷۔ایضاً (ص ۔ ۲۷۷)

۷۸۔ایضاً (ص ۔ ۲۱۷)

۷۹۔ایضاً (ص ۔ ۲۱۰)

۸۰۔ایضاً (ص ۔ ۱۱۸)

۸۱۔ایضاً (ص ۔ ۲۷۴)

۸۲۔ایضاً (ص ۔ ۲۰۱)

۸۳۔ایضاً (ص ۔ ۲۱۷)

۸۴۔ایضاً (ص ۔ ۳۱۳)

۸۵۔ایضاً (ص ۔ ۲۴۷)

۸۶۔ایضاً (ص ۔ ۲۷۴،۲۷۳)

۸۷۔ایضاً (ص ۔ ۳۰۴)

۸۸۔ایضاً (ص ۔ ۹۰)

۸۹۔ایضاً (ص ۔ ۹۶)

۹۰۔ایضاً (ص ۔ ۲۰۲)

۹۱۔ایضاً (ص ۔ ۲۷۹،۲۷۸)

۹۲۔ایضاً (ص ۔ ۲۳۵)

۹۳۔ایضاً (ص ۔ ۲۸۸)

۹۴۔ایضاً (ص ۔ ۲۱۷)

۹۵۔ایضاً (ص ۔ ۲۱۲)

۹۶۔ایضاً (ص ۔ ۲۷۷)

حاصلِ مطالعہ

۱۹۴۷ء کا واقعہ برِصغیر ہند و پاک کی تاریخ میں بہت اہمیت کا حامل ہے۔اسی سال انگریزی سامراجیت کا خاتمہ ہوا اور ملک کو آزادی نصیب ہوئی۔آزادی کے ساتھ ساتھ بہت سے نئے پیچیدہ مسائل بھی پیدا ہوئے۔ یہ ہند و پاک کی تاریخ کا ایک ایسا المیہ ہے،جس کا اثر سماج کے ہر طبقے کے انسان پر پڑا۔خاص کر ادیبوں پر چاہے وہ ہندستان کا ادیب ہو یا پاکستان کا، اردو کا ہو یا ہندی کا سب نے اس درد کو بہت ہی شدت کے ساتھ محسوس کیا اور اپنے ادب پاروں میں اس درد کا اظہار کیا۔اس ضمن میں انتظار حسین کا نام سرِفہرست ہے۔تقسیمِ ہند کے تناظر میں پیش آنے والی کرب انگیز ہجرت کا ذاتی تجربہ رکھنے والے اس ادیب نے نقلِ مکانی کے ان خونی مناظر کو روشِ عام سے ہٹ کر تحریر کیا ہے جن کے وہ عینی شاہد تھے۔

۱۹۴۷ء میں ہندستان تقسیم ہو کر آزاد ہوا، ملک ہی نہیں بلکہ تہذیب، خاندان، گھر حتیٰ کہ انسان کا وجود تقسیم ہو گیا۔تقسیم اور ہجرت کا کرب ہند و پاک کے سارے ادب خصوصاً اردو ادب میں زیادہ ملتا ہے۔اس المیے پر تمام ادیب یک زباں ہو کر چیخ اٹھے۔اس پورے المیے اور عہد کے درد و کرب کا اثر اردو ناولوں اور افسانوں پر ہوا۔ ادب کی تمام اصناف میں ناول ہی ایک ایسی صنف ہے جس میں انفرادی اور داخلی کیفیت کے ساتھ ساتھ اجتماعی اور خارجی زندگی کے حقائق کی بھی مکمل اور مفصل تصویر دیکھی جا سکتی ہے۔اردو زبان میں ۱۹۴۷ء کے بعد تقسیمِ ہند سے متعلق بے شمار ناول سپردِ قلم کیے گئے۔تقسیمِ ہند ہماری قومی زندگی کا اتنا اہم واقعہ ہے کہ اس کے نتائج کا احساس و ادراک وقت گزرنے کے ساتھ بڑھتا رہا ہے۔اس کا اثر اردو زبان و ادب پر بہت گہرا پڑا۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت گویا تکمیل تھی اس عوامی عداوت کی جو ہندستان کے قدیم نظامِ معیشت کی بے انتہا تباہی کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔لیکن اس عداوت میں مخالفت بھی شامل تھی۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت وہ عظیم الشان اور

ناقابلِ فراموش واقعہ ہے جس نے ہندستانیوں کی آنکھیں کھول دیں اور ان میں سیاسی شعور کو بیدار کیا۔ اس بغاوت نے یہاں کی سیاسی ،اقتصادی، اور سماجی زندگی کوتہہ و بالا کر دیا جس سے ہندستانی معاشرے کا شیرازہ بکھر گیا۔اسی بغاوت کے بعد انگریزوں نے اپنی نئی پالسی کا نقشہ جوملکہ وکٹوریہ کے مشہور اعلان مورخہ نومبر ۱۸۵۷ء میں صاف نظر آتا ہے،کواپنایا جس کے اثرات ابھی بھی ہندستانیوں کی رگ رگ میں سمائے ہوئے ہیں اور آئے روز اس کو عملی شکل دینے سے بھی نہیں کتراتے۔اعلان نامہ کچھ یوں تھا:

''ہماری کوشیش یہ ہونی چاہئے کہ ہم پوری طاقت کے ساتھ مختلف مذہبوں اور فرقوں کے بیچ موجودہ بھید بھاؤ بنا رہنے دیں۔ہمیں یہ بھید بھاؤ ختم کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے۔''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' ہی ہندوستانی سرکار کا اصول ہونا چاہئے۔''

۱۸۵۷ء کی بغاوت میں ہندو مسلمان دونوں نے متحد ہو کر مظاہرہ کیا تھا جس سے غیر ملکی حکمران پریشان ہو گئے تھے۔اس لیے انھوں نے ہندو مسلم اتحاد کو توڑنے کی ہر ممکن کوشش کی۔

جیسا کہ مقالے کے عنوان انتظار حسین اور ان کے ناولوں میں تقسیم اور ہجرت کا کرب کا ذکر اور تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔ یوں تو تقسیمِ ہند اور ہجرت پر بہت سارے ناول لکھے گئے ہیں لیکن راقم نے صرف انتظار حسین اور ان کے ناولوں کو مقالے کا موضوع بنایا۔انتظار حسین کا ادبی سفر تقریباً چھ دہائیوں پر محیط ہے۔موصوف کا شمار اردو ادب کے ان چند ادیبوں اور فکشن نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے ادب کی مختلف اصناف پر طبع آزمائی کی ہے۔ وہ کثیر الجہت ادبی شخصیت کے حامل ہیں۔انہوں نے افسانے ،ناول،سفرنامے،صحافتی کالم،تنقیدی مضامین اور سوانحی عمری سپردِ قلم کیے۔مگر فکشن کی دنیا میں انہیں ایک خاص اہمیت ومقبولیت حاصل ہے۔ وہ اپنے افسانوں اور ناولوں کی وجہ سے عالمی ادب اور خاص طور پر اردو فکشن میں ایک منفرد مقام ومرتبہ پر فائز ہیں۔

ہجرت کا ذاتی تجربہ رکھنے والے انتظار حسین کے معاصرین میں شوکت صدیقی ،قرۃالعین حیدر، خدیجہ مستور، رامانند ساگر،قدرت اللہ شہاب وغیرہ نے بھی تقسیمِ ہند اور ہجرت کے موضوع پر ناول سپردِ قلم کیے ہیں جن

میں ناول ''آنگن''، ''اور انسان مر گیا''، ''آگ کا دریا'' اور ناولٹ ''یا خدا'' وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ مقالے میں درج انتظار حسین کے معاصرین ہجرت کے کرب کا ذاتی تجربہ رکھتے ہوئے مہاجرین کے حالات کو اپنی تخلیقات کی زینت بناتے ہیں۔

جہاں تک انتظار حسین کا سوال ہے، انہوں نے جس دور میں لکھنا شروع کیا اس وقت اردو میں دو قسم کی کہانیاں لکھی جا رہی تھیں۔ ایک ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر، جو ادب برائے زندگی کو فروغ دے رہی تھیں۔ دوسری منٹو کے زیرِ اثر جنسی حقیقت نگاری کے تحت جن کا بنیادی محور عورت تھا۔ نئے لکھنے والے عام طور پر اپنے آپ کو ان میں سے کسی ایک نقطۂ نظر سے وابستہ کرتے۔ جہاں تک انتظار حسین کا تعلق ہے، انہوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ اس کے برعکس روشِ عام سے انحراف کرتے ہوئے اپنی ایک علاحدہ شناخت بنائی۔ انہوں نے نہ جنسی موضوعات سے اپنی کہانیوں کو مزین کیا اور نہ ہی ترقی پسند تحریک کی سماجی حقیقت نگاری سے اپنی کہانیوں کو حرکت دی بلکہ انہوں نے گم شدہ ماضی کی بازیافت کی کوشش کی جس کے نتیجے میں ان کے ہاتھ بے شمار گم شدہ کہانیاں آ گئیں۔ اس طرح انہوں نے اردو فکشن کے محدود دائرے کو وسعت بخشی۔

انتظار حسین کے ناولوں کے خاص موضوعات تقسیمِ ہند، فسادات، ہجرت، ماضی کی بازیافت، مذہبی و اخلاقی اقدار کی شکست و ریخت، ذہنی انتشار، تشکیک، خوف، محرومی و مایوسی کا احساس، عدم شناخت، تہذیبی و معاشرتی رشتوں کے زوال کا احساس، سقوطِ مشرقی پاکستان اور ان سب کے نتیجے میں انسان کا مرتبہ انسانیت سے گر جانا بلکہ حیوان کے قالب میں تبدیل ہو جانا شامل ہے۔ موصوف اپنے ناولوں اور اکثر افسانوں میں ان تمام مسائل و موضوعات کے ساتھ فرد کی ذات پر پڑنے والے مختلف اثرات کا بھی احاطہ کرتے ہیں۔

انتظار حسین کا شمار ان فکشن نگاروں میں ہوتا ہے جو بہ ذاتِ خود ہجرت کے کرب سے گزرے تھے۔ ہجرت کا تجربہ ان کے ناولوں کا غالب موضوع ہے چوں کہ انتظار حسین نے خود ایک مہاجر کی زندگی گزاری تھی اور وہ ان تمام واقعات و حالات کے چشم دید گواہ تھے جو ایک عام مہاجر کو سہنے پڑے تھے۔ اس لیے انہوں نے مہاجرین کے اس کرب و درد اور ذہنی و نفسیاتی احساس کو شدت سے محسوس کیا جو اپنی تہذیب، ماحول، اقدار،

روایات اورعزیز و اقارب سے بچھڑنے پر پیدا ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے بیشتر افسانوں اور چار ناولوں کا کلیدی تجربہ ہجرت کا ہے۔انتظار حسین نے اپنے اس ذاتی تجربے کو تمام بنی نوع انسان اور بالخصوص مسلمانوں کی ہجرت سے مربوط کر کے ایک عالم گیر تجربہ بنا دیا۔ہجرت کا تجربہ اب صرف انتظار حسین کا ذاتی تجربہ نہ رہا بلکہ اپنے دائرے کو وسیع تر کر کے اور زمان ومکان کی حد بندیوں سے بلند و بالا ہو کر ایک وسیع انسانی تجربہ بن گیا۔اسی بنیادی تجربے نے انتظار حسین کے ناولوں میں انسان کے روحانی ،اخلاقی ، معاشرتی اور تہذیبی زوال و انحطاط جیسے موضوعات کے لیے راہیں ہموار کیں۔

انتظار حسین اپنے عہد کے سیاسی ،سماجی ، معاشی ، معاشرتی اور تہذیبی حالات اور واقعات کی بھی مکمل خبر رکھتے تھے۔انہوں نے ۱۹۴۷ء سے لے کر آج تک کی صورت حال پر فنکارانہ بصیرت سے نظر رکھی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں اور ناولوں میں قیامِ پاکستان ، قیامِ پاکستان کے بعد کے حالات ، ۱۹۶۵ء کی جنگ ، ۱۹۷۱ء کی جنگ اور سقوطِ مشرقی پاکستان کا المیہ، ہندستان اور پاکستان کا ایٹمی دھماکہ اور تجربہ اور ان سب سے پیدہ شدہ انفرادی و اجتماعی مسائل سمیت تاریخی، سماجی ،تہذیبی اور انسانی پہلوؤں کی مکمل عکاسی نظر آتی ہے۔انتظار حسین نے تقسیمِ ہند کے بعد رونما ہونے والے ان نفرت بھرے واقعات کو اپنے افسانوں اور ناولوں میں منفرد انداز میں پیش کیا ہے۔

انتظار حسین کے چار ناولوں جن کا تجزیہ راقم نے تقسیمِ ہند اور ہجرت کے کرب کے حوالے سے مقالے میں پیش کیا ہے۔ ان تمام ناولوں میں مصنف کا غالب موضوع مہاجرین اور ان کے مسائل ہیں۔'' چاند گہن''، ''بستی''، ''تذکرہ'' اور'' آگے سمندر ہے'' انتظار حسین کے ان سبھی ناولوں میں مہاجر کردار پیش کر کے ہجرت کے کرب اور درد کو محسوس کرایا گیا ہے۔ان تمام ناولوں میں انتظار حسین ملک کی تقسیم سے نالاں نظر آتے ہیں۔نئے ملک میں مہاجر کرداروں کی زبوں حالی کو ناولوں میں پیش کر کے مصنف نے یہ واضح کیا ہے کہ تقسیم سے خوش حال لوگ بدحالی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوئے۔قیامِ پاکستان لاکھوں لوگوں کے قتلِ عام ، ہزاروں عورتوں کی عصمت دری اور ان گنت لوگوں کی بے سروسامانی کی حالت میں نقلِ مکانی کا پیغامِ بدلے کر آئی تھی۔لوگوں کی معصومیت

رخصت ہوگئی ، ناز و نعم سے پلا بڑھا بیٹا یا بیٹی جب اپنے خاندان کے سبھی افراد کو کھو دیتا ہے تو اس کی ہر خوشی کو گویا آگ لگ جاتی ہے اور وہ موت کے انتظار میں دن بسر کرتا ہے ۔ ناول ''بستی'' میں 'صابرہ' کے ایسے ہی حالات کو پیش کر کے مصنف نے تقسیم اور ہجرت کی تلخ حقیقت کو بے نقاب کیا ہے ۔

انتظار حسین نے اپنے ناولوں میں تقسیمِ ہند اور اس کے بعد کے حالات اور مہاجرین کی زندگی کی حقیقتوں کا پردہ چاک کیا ہے ۔ فرقہ وارانہ فسادات ، قتل و غارت گری ، مہاجرین کی زندگی کا اضطراب ، تعصب ، احساسِ بے دخلی اور جلاوطنی ، انسانی قدروں کی شکست جیسے موضوعات اپنائے جو سسکتی زندگی کو پیش کرتی ہے ۔ مختصر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انتظار حسین ایک ایسے منفرد ادیب ہیں جنھوں نے اردو ادب کی جس صنف پر بھی قلم اٹھایا اس پر اپنی شخصیت کے انمٹ نقوش ثبت کیے اور اپنی تخلیقی مہارت اور فنی انفرادیت سے اسے نئی سمت و رفتار عطا کی ہے ۔ مزید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ راقم نے مقالے کے لیے موصوف کے ناولوں پر جو مفروضہ پیش کیا تھا وہ حق بہ جانب ثابت ہوا ہے ۔ موصوف کے چار ناولوں میں تقسیمِ ہند اور ہجرت کے کرب کا موضوع ہی سامنے آتا ہے جس کی تفصیل مقالے میں موجود ہے ۔

کتابیات

۱۔	احسن فاروقی، ڈاکٹر	اردو ناول کی تنقیدی تاریخ	فروغ اردو لکھنو	۱۹۶۲ء
۲۔	ارتضیٰ کریم	انتظار حسین ایک دبستان	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی	۱۹۹۶ء
۳۔	ارتضیٰ کریم	جوگندر پال ذکر، فکر، فن	موڈرن پبلشنگ ہاوس، دہلی	۱۹۹۹ء
۴۔	اسلم آزاد، ڈاکٹر	اردو ناول آزادی کے بعد	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی	۲۰۲۰ء
۵۔	انتظار حسین	آخری آدمی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی	۲۰۱۷ء
۶۔	انتظار حسین	آگے سمندر ہے	مکتبہ جامعہ، نئی دہلی	۲۰۱۱ء
۷۔	انتظار حسین	بستی	مکتبہ جامعہ، نئی دہلی	۲۰۱۱ء
۸۔	انتظار حسین	تذکرہ	مکتبہ جامعہ، نئی دہلی	۱۹۸۷ء
۹۔	انتظار حسین	جستجو کیا ہے	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور	۲۰۱۱ء
۱۰۔	انتظار حسین	جنم کہانیاں	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور	۱۹۸۷ء
۱۱۔	انتظار حسین	چراغوں کا دھواں	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور	۱۹۹۹ء
۱۲۔	انتظار حسین	چاند گہن	عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی	۲۰۱۳ء
۱۳۔	انتظار حسین	چراغوں کا دھواں	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی	۲۰۱۲ء
۱۴۔	انتظار حسین	شہرِ افسوس	سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور	۲۰۱۱ء
۱۵۔	انور پاشا، ڈاکٹر	ہندو پاک میں اردو ناول	شارپ پرنٹرز، نئی دہلی	۱۹۹۲ء

۱۶۔ یوسف سرمست	بیسویں صدی میں اردو ناول	نیشنل بک ڈپو، حیدر آباد	۱۹۷۳ء
۱۷۔ سلیم اختر، ڈاکٹر	اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ آغاز سے ۲۰۰۰ء تک	ایس ایچ، دہلی	۲۰۱۳ء
۱۸۔ سنبل نگار، ڈاکٹر	اردو نثر کا تنقیدی مطالعہ	ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ	۲۰۱۷ء
۱۹۔ عبدالباسط، ڈاکٹر	انتظار حسین کا تنقیدی شعور	ایجوکیشنل بک ہاوس، دہلی	۲۰۱۹ء
۲۰۔ فوزیہ اسلم، ڈاکٹر	اردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجربات	پورب الادمی، اسلام آباد	۲۰۰۷ء
۲۱۔ گوپی چند نارنگ	انتظار حسین اور انکے افسانے	ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ	۱۹۸۶ء
۲۲۔ نعیم انیس، ڈاکٹر	انتظار حسین حیات وفن	ضحیٰ پبلی کیشنز، کولکاتا	۲۰۱۷ء
۲۳۔ وقار اعظیم	داستان سے افسانے تک	ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ	۲۰۰۳ء
۲۴۔ وہاب اشرفی	تاریخ ادب اردو، جلد سوم	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی	۲۰۰۷ء
۲۵۔ ف۔س۔اعجاز	ماہنامہ انشاء	انشاء پبلی کیشنز، کلکتہ	۲۰۰۸ء

سبق اردو

جون،۲۰۲۲

ایڈیٹر،پرنٹر،پبلشر : ڈاکٹر محمد سلیم | سرنامہ : عادل منصوری | جلد : ۷ | شمارہ : ٦

موبائل:9696486386 | سرورق : دانش الہ آبادی | Net Banking:SABAQ -E-URDU(MONTHLY)

واٹس ایپ:9919142411 | کمپوزنگ : دانش الہ آبادی، اہل قلم | IFSC BARB 0 GOPI BS A/C28240200000214

sabaqeurdu@gmail.com | مطبع: عظیم انڈیا پریس، گوپی گنج، بھدوہی | Bank of Baroda, Branch: Gopiganj

فی شمارہ: -/100، زرتعاون: -/1000 | زرتعاون خاص: -/2000، اعزازی تعاون: -/5000 | Gopiganj-221303,Dist.Bhadohi,UP,INDIA

کسی بھی تحریر سے ادارہ کا متفق ہونا لازمی نہیں ہے۔ کسی بھی معاملے کی سنوائی صرف ضلع بھدوہی ہی کی عدالت میں ہوگی۔ ادارہ

چیف ایڈیٹر
ڈاکٹر دانش الٰہ آبادی

محمد رضی الرحمٰن	اردو شاعری میں حضرت سلیمانؑ کی تلمیح	۵
ڈاکٹر حنا آفرین	بلونت سنگھ اپنی خود نوشت کے آئینے میں	۷
ڈاکٹر نصرت جبین	میریات کی روایات کا امین : فریدؔ پربتی	۱۲
ڈاکٹر رضوانہ شمسی	ترقی پسند تحریک کی سیاسی اور سماجی جهتیں	۱٦
تنویر احمد میر	افسانہ "جوگیا" کی نفسیاتی تحلیل	۲۰
سلمان عبد الصمد	منٹو اور تضاداتِ 'نیا قانون'	۲۲
ڈاکٹر حمیرہ جان	کشمیری ترقی پسند افسانہ : ایک جائزہ	۲۷
ڈاکٹر نصرت بشیر	کشمیر کی مشہور غنائیہ شاعر حبہ خاتون	۲۹
محمد ضیاء المصطفٰی	سر پنچ ہند، لکھنؤ : ایک تحقیقی و تنقیدی جائزہ	۳۱
ڈاکٹر محمد امین اللہ	"شگوفہ" رسالہ یا تحریک	۳۳
محمد سکندر خان	چکبستؔ : ایک وطن پرست شاعر	۳۵
ظہور احمد گنائی	کلامِ اقبال : عصرِ حاضر کے تناظر میں	۳۷
عائشہ صدیقہ	مولاناابولکلام آزاد اورصحافت	۳۹
ڈاکٹر عاشق حسین	شیخ العالمؒ کی شاعری کا ایک سرسری مطالعہ	۴۴
شیخ شامر عرفات	تنویر واحدی :ایک تعارف	۴۷
نجم الثاقب عباسی	مولانا علی میاں ندویؒ کا ادبی ماحول اور شعر و سخن کا ذوق	۴۹
ڈاکٹر قرۃ العین	ڈراما "سری رام ناٹک" ایک جائزہ	۵۲
ڈاکٹر محمد اسلم پرویز اسلم	ہندوستان کے غیر ملکی سفر نامہ نگار اورُردو سفرنامہ(روایت وارتقاء)	۵۴
ڈاکٹر عبد الخالق	اردو صحافت: ایک نظر میں	۵۷
نور فاطمہ	اسلامی تانیثیت کابنیادی کلامیہ	۵۹

محمد عرفان	کاسمو پولیٹن ڈریمز ، نو آبادیاتی جنوبی ایشیا میں جدید اردو ادبی ثقافت کی تشکیل ، اور ابتدائی اردو	۶۳
تسنیم زھرہ	ودربھ کی معارف افسانہ نگار ۔ ثریا صولت حسین	۶۶
عافیہ حمید	حیات اللہ انصاری کے افسانوں کا مختصر جائزہ	۷۰
ڈاکٹر نکہت فاطمہ	امیر خسرو: مرید محبوب حضرت محبوب الٰہی	۷۲
نذیر احمد نجار	کشمیری لوک ادب ماضی کا آئینہ دار	۷۵
ڈاکٹر امتیاز مصطفٰی	کشمیری زبان کے معروف ادیب اختر محی الدین کی ناول نگاری	۷۷
ڈاکٹر ثمرین گیلانی	گاندھی جی کا فلسفہ صداقت اور عدم تشدداور دور حاضر میں اسکی مشابہت	۷۹
ڈاکٹر علی محمد ڈار	لل دیدؔ کی شاعری میں تلاش حق کا درس	۸۱
سید یحییٰ ید اللٰھی	صحافی کی ذمہ داریاں	۸۳
ڈاکٹر زیب النساءؒ سعید	سجاد ظھیر کا تنقیدی رویہ	۸۶
ڈاکٹر عنایت علی شاہ	لسان الصدق کا نو جوان انقلابی صحافی	۸۹
ڈاکٹر طارق احمد مسعودی	اقبال کے تصور تعلیم کی عصری اھمیت، حکمت قر آن کے آئینے میں	۹۱
سلیمہ اختر	نور شاہ کے افسانوں میں کشمیر کے سیاحی و سماجی حالات	۹۳
شیخ شامر عرفات	اخلاقیات تحقیق	۹۶
نجم الثاقب عباسی	اقبال کی شاعری اور مولانا علی میاں ندویؒ	۹۸
انجم پروین	ڈاکٹر اسلم پرویز اسلمؔ ۔ فکر و فن کا شاعر	۱۰۱
ڈاکٹر قیام الدین انصاری	نظیر اکبر آبادی کی عوامی شاعری میں ھندوستانی عناصر	۱۰۳
محمد باقر حسین	دبستانِ کوٹہ کے بنیاد گذار : سید افضل حسین ثابتؔ لکھنوی(تلخیص)	۱۰۵
مزمل شیلی	بلونت سنگھ کا افسانہ " جگّا " ایک تجزیاتی مطالعہ	۱۰۷
فرید خان	قیسی رامپوری کی تحریروں میں تحفّظِ بشر کے دائمی عناصر	۱۱۱
محمد یاسر	انتظار حسین تحریکات و رجحانات کی خانہ بندیوں سے آزاد ادیب	۱۱۳
کفیل احمد	شعر اقبال کا اسلوبیاتی آھنگ اور ردیف و قوافی کے رنگ	۱۱۵
ڈاکٹر ناصرہ سلطانہ	داغ دھلوی کی شاعری میں عشقیہ جذبات و احساسات کی کار فرمائی	۱۱۶
الطاف احمد میر	اردو انشائیہ میں ترجمے کی اھمیت	۱۱۸
اعجاز احمد ڈار	پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کے ادبی متون اور ڈاکٹر ارشد اقبال	۱۲۱
ڈاکٹر الطاف حسین	جموں و کشمیر میں اردو کے ابتدائی نقوش	۱۲۴
اے۔ آر۔ منظر	دوّیہ بانی : دلت سماج کی ایک آواز	۱۲۶
شاھینہ پروین	پلیگرزم (Plagiarism)	۱۲۸

لیکن دل میں پیار ہی پیار بھرا ہوا ہے۔''

(افکار قیسی رامپوری۔مرتبہ،ڈاکٹر شاہد جمالی۔۲۰۲۰ء۔ص،۵۰۔۵۱)

یہ بنیادی باتیں ہیں جن کی جانب قیسی رامپوری نے توجہ دلائی ہے،اور جن کے تصور کے بغیر ''تحفّظِ بشر'' ممکن نہیں۔ایک اور جگہ قیسی رامپوری رقم طراز ہیں،

''ہم نے اس جنگ کو (دوسری جنگِ عظیم) زیادہ تر سلطنتوں کی لڑائی سمجھا اور کمتر،تہذیب،نظام،نظریہ وفکر کا تصادم۔۔ہم نے اس ہیبتناک تاریخی ٹکر کے شعلوں میں حرّیت خیال کے حسن کو تو دیکھ لیا۔مگر اس کے ننگے پن پر ہماری نظر نہ گئی۔ہم نے گھروں کے افلاس پر تو آنسوں بہائے مگر افراد کے افلاسِ دماغی میں کبھی ہماری پلکیں تر نہیں ہوئیں۔ہم نے پیٹ کی بھوک،جنسی بھوک،ضروریات کی بھوک کو اتنا اجاگر کیا کہ زبردستی کسی کے سر ہو جانے کو جی چاہنے لگا۔مگر بھوک بخش عناصر میں تہذیب پیدا کرنے کی تکلیف نہیں کی۔ہم نے خدا کے وجود کو باطل کرنے میں تو اتنی جلدی کی،مگر اس کی ذات کو سمجھنے میں اتنی دیر کہ فلسفہ واقتصادیات نژاد نظام ربوبیت کی سرحدوں میں آ گھسیا۔غرض ہم نے حقائق کی اپنی دانست میں کچھ ایسی عکاسی کی کہ زیادہ توجہ کی مستحق حقیقتیں دب کر رہ گئیں۔''

(افکار قیسی رامپوری۔۲۰۲ء۔ص،۶۳)

ذیل کے اقتباس میں قیسی رام پوری نے مکمل اور واضح خیال پیش کر دیا ہے، جو ''تحفّظِ بشر'' کی مثال پیش کرتا ہے۔

''ادب کا یہ فرض یقیناً ہے کہ ہندوستانیوں کے morals بلند کرے۔عام پیار کی اسپرٹ ان میں جگائے۔ابتلا کے وقت اپنا ہی سر بچانے کی ہم فکر نہ کریں۔اپنے ہی بال بچوں کو پروں میں دبائے نہ بیٹھیں۔اپنی ہی دولت، عزت و جان،تجارت،معاش وغیرہ کی فکر نہ کریں۔تنہا اپنا ہی گھر بھر لینے کی کوشش نہ کریں۔دوسروں کے کام آئیں،نفسی بزدلی سے گریز کریں۔غرض انانیت کو درجہ ثانوی دیں۔''

(افکار قیسی رامپوری۔۲۰۲۰ء۔ص۔۶۸)

قیسی رامپوری کا ناول ''اپاہج'' ایک بہت جذباتی ناول ہے،اس میں بھی انھوں نے یہی پیغام دیا ہے کہ آدمی کی معراج یہ ہے کہ وہ دوسروں پر خود کو قربان کر دے۔ناول کا ہیرو ''کشوری'' جب اپاہج ہیروئن کو اپنے علاج سے ٹھیک کر دیتا ہے،تو ہیروئن کا باپ خود آگے ہو کر لڑکی کا ہاتھ اس کے ہاتھ دیتا ہے۔یہ ایسا موقع تھا کہ کشوری اس کے ذریعہ سارے ملک میں ایک معتبر اور با عزت ڈاکٹر بن سکتا تھا،لیکن اس نے ہیروئن کی خوشی کی خاطر اپنی غرض کو قربان کر دیا۔کشوری کے اس عمل سے نہ کوئی جھگڑے ہوئے اور نہ کوئی فساد ہوا۔بلکہ جو لوگ شاکی تھے وہ بھی خوش ہو گئے۔

انتظار حسین

تحریکات ورجحانات کی خانہ بندیوں سے آزاد ادیب

محمد یاسر

تحریکوں کی وابستگی اور خانہ بندیوں سے مبرّہ ومنزّہ ادیب انتظار حسین ۲۱ دسمبر ۱۹۲۵ء کو غیر منقسم ہندوستان کی موجودہ ریاست اتر پردیش کے ضلع بلند شہر میں واقع ایک قصبے ڈبائی میں ولادت پائے۔بیسویں صدی کے فکشن میں 'انتظار حسین' ایک ایسا نام ہے جو اپنی ایک علیحدہ پہچان کے لئے جانے جاتے ہیں اور اپنے آپ میں ایک دبستان کی حیثیت رکھتے ہیں۔موصوف نے نو افسانوی مجموعے،چار ناول،ایک ناولٹ،بے شمار کالم،ڈرامے،خاکے،تراجم اور تنقیدی مضامین سپردِ قلم کئے۔ان کی اصل شہرت کا سبب ان کا افسانوی ادب ہے۔انتظار حسین ایک ایسے ادیب وفنکار ہیں جنہوں نے اپنے زمانے کی ادبی روایت سے انحراف کرتے ہوئے اپنا ایک نیا راستہ دریافت کیا اور اسی پر چلنا اپنا شعار بنایا۔وہ بیک وقت ایک ادیب، مصنف، مولف، مدون، مترجم، ڈراما نگار، صحافی اور نقاد کے طور پر بیسویں صدی کے آسمانِ ادب پر اپنے ہم عصروں سے ممیّز نظر آتے ہیں۔

انتظار حسین نے جس دور میں لکھنا شروع کیا اس وقت اردو کے افسانوی ادب میں دو قسم کی کہانیاں لکھی جا رہی تھی۔ایک ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر،جو ادب برائے زندگی کو فروغ دے رہی تھی۔دوسری منٹو کے زیرِ اثر جنسی حقیقت نگاری کے تحت،جن کا بنُیادی محور عورت تھی۔نئے لکھنے والے عام طور پر اپنے آپ کو ان میں سے کسی نقطۂ نظر سے وابسطہ کرتے۔جہاں تک انتظار حسین کا تعلق ہے، انہوں نے ایسا کرنے کے بجائے روشِ عام سے انحراف کو اپناتے ہوئے اپنی ایک علیحدہ شناخت قائم کی۔انہوں نے نہ جنسی موضوعات سے اپنی کہانیوں کو مزین کیا اور نہ ہی ترقی پسند تحریک کی سماجی حقیقت نگاری سے اپنی کہانیوں کو جِلا بخشی بلکہ انہوں نے گم شدہ ماضی کی بازیافت اور جڑوں کی تلاش کی کوشش کی جس کے نتیجے میں ان کے ہاتھ بے شمار گم شدہ کہانیاں آ گئیں۔اس طرح انہوں نے فکشن کے محدود دائرے کو وسعت بخشی۔موصوف نے نہ صرف ترقی پسند تحریک کے سکہ بند اصولوں کی زنجیروں کو توڑا بلکہ ابھرتے ہوئے 'جدیدیت' نامی رجحان کا بھی خود کو حد درجہ مقید نہیں کیا۔اپنی تخلیقی کاوشوں کو اپنے ہی منفرد انداز میں قلم بند کرتے رہے۔کسی تحریک یا رجحان سے ادیب کی وابستگی ان کی نگاہ میں معیوب شے تھی۔اس بات کا برملا اظہار انھوں نے اپنے ایک انٹرویو کے دوران مقصود دانش سے کیا جو ''انتظار حسین سے گفتگو'' کے عنوان سے ماہنامہ ''انشاء'' کلکتہ کے نومبر ۲۰۰۸ء کے شمارے میں شامل ہے۔ماہنامہ میں درج انٹرویو کے چند سوالات وجوابات ملاحظہ ہوں :

مقصود دانش : ترقی پسندوں نے بھی آپ کو اپنی طرف کھینچا۔جدیدیوں نے بھی اور اب مابعد جدیدیت والے بھی آپ کو اپنا کہہ رہے ہیں ؟

انتظار حسین : دیکھئے بھائی ! میں تو پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ فن کار کو ان سب

جھمیلوں میں نہیں پڑنا چاہئے ۔اگر میری تخلیقات مذکورہ ادبی رویوں کو مواد فراہم کررہی ہیں تو میرے لئے مسرت کی بات ہے۔لیکن یہ خانہ بندی میرے ذہن میں نہیں ہے۔

مقصود دانش : آپ کی بیش تر تخلیقات میں یا تو بوڑھی خواتین نمودار ہوتی ہیں کردار کے طور پر یا تو بیوہ صفت جوان عورتیں،سوگندی جیسی عورتیں آپ کے ہاں نظر نہیں آتی ؟

انتظار حسین : آپ نے بالکل سچ کہا،میرے ہاں سوگندی جیسی عورتیں آ بھی نہیں سکتیں۔ میں ایک ایسے معاشرے ۔۔۔بوڑھی خواتین سے ہی مماثل ہے۔ میرے ہاں جوان بیوہ صفت عورتیں ۔۔۔۔جس زمین کی کہانی لکھتا ہوں اس کا حسن ذائل ہو چکا ہے۔اس کے گہنے کسی نے چھین لئے ہیں، یہ زمین مجھے بیوہ کے روپ میں نظر آتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ سوگندھی ہمارے ہاں نہیں آسکتی۔ [۱]

انتظار حسین کی کہانیوں کے تین ادوار ہیں جن میں : پہلے دور کی کہانیوں میں اپنے بچپن کو یاد کرتے ہیں۔ **Nostalgia** کے شکار نظر آتے ہیں۔اس دور میں وہ بیدی،کرشن چندر،عصمت چغتائی وغیرہ جیسے فن کاروں کی تخلیقات کو بطورِ نمونہ سامنے رکھتے ہیں۔دوسرے دور کی کہانیوں میں اپنی داستانوی روایت میں میر امن وغیرہ سے متاثر نظر آتے ہیں۔ نیز تصوف کی روایت سے دلچسپی جتاتے ہیں۔الف لیلہ کا مطالعہ کرتے ہیں۔تیسرا دور جاتھک کتھاؤں اور سرتِ ساگر جس میں ایک نئ طلسمِ ہوش ربا 'مہابھارت' نظر آتی ہے،جس میں جنموں کی کہانی ہے جو مختلف روپ میں نمودار ہوتے ہیں۔موصوف کے مطابق اردو فکشن کی روایت میں تین دھاریں ملتی ہیں۔

(الف) عرب وعجم کی روایت (ب) مغرب کی روایت (ج) قدیم ہندوستان کی روایت

انتظار حسین ان تینوں دھاروں کو بروئے کار لاکر اپنی کہانی بنتے ہیں۔ موصوف نے اپنی تخلیقی راہ کو خود کرید کر بنایا ہے۔ وہ دوسروں کے بندھے ٹکے اصولوں کے کبھی پابند نہیں رہے ۔انہوں نے جو ادب تخلیق کیا وہ ماضی اور حال کا بہترین امتزاج ہے۔ان کی تخلیقات کو پڑھنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ ایلیٹ نے اچھے ادیب کی جو تعریف کی ہے،وہ انتظار حسین پر صادق آتی ہے اور ان کی تخلیقات اس کا عکس پیش کرتی ہے۔ پروفیسر شمیم حنفی ایلیٹ کا یہ قول نقل کرتے ہوئے انتظار حسین کے مقام کا تعین ان الفاظ میں یوں کرتے ہیں:

'' اچھا ادیب جو ہوتا ہے ۔وہ اپنے حال ہی پر اثر انداز نہیں ہوتا ۔اپنے ماضی پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔'' [۲]

ان کی تخلیقات کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد صاف ظاہر ہوتا ہے کہ عظیم ادب سرحدوں اور نظریوں کا مقید نہیں ہوتا ہے ۔انتظار حسین چونکہ روشِ عام سے ہٹ کر لکھنے والے ادیب ہے،اس لئے ان کے افکار کو سمجھنا عام قاری کے لئے دشوار ہے ۔ان کا فنکارانہ اسلوب اور ماضی وحال کے امتزاج کی وجہ سے ان کی تخلیقات ذہین اور باذوق قاری کو تلقین کرتی ہیں ۔علاماتی واستعارتی ، داستانوی، اساطیری ،دیومالائی اسلوب سے اردو فکشن کو مغرب کے جدید فکشن کے مدِ مقابل کھڑا کر دیا۔ان کی انفردایت اور لاثانی اسلوب کے بارے میں مابعد جدید تھیوری کے نامور نقاد گوپی چند نارنگ یوں رقم طراز ہیں :

'' انتظار حسین اس عہد کے اہم ترین افسانہ نگاروں میں سے ہیں۔اپنے پر تاثیر تمثیلی اسلوب کے ذریعے انہوں نے اردو افسانے کو نئے فنی ۔۔۔ رشتہ بیک وقت داستان ، حکایت ، قدیم اساطیر اور دیو مالا سے ملا دیا ۔۔۔ داستانی انداز ہمارے اجتماعی لاشعور اور مزاج کا کئی زیادہ ساتھ دیتا ہے۔'' [۳]

انتظار حسین چونکہ ذہنی طور پر ادیبوں کی خانہ بندی کے قائل نہیں تھے،اس لئے ان کی تخلیقات میں ہر طرح کے موضوعات سمائے ہیں۔ان کے یہاں رشتوں کی شکست وریخت،ڈر،خوف،ذہنی انتشار،جلاوطنی،سفرِ داخلی وذہنی کیفیات، کرب،تنہائی،احساسِ محرومی ومایوسی،احتجاج،ماضی کی بازیافت اور کھوئے ہوئے رشتوں کی تلاش جیسے دل سوز و دل خراش موضوعات کو اپنی تخلیقات کی زینت بنایا ہیں۔تقسیمِ ہند کے بعد تخلیق کئے گئے اردو فکشن میں انتظار حسین اپنے افسانوں اور ناولوں کے منفرد اسلوب اور علامتی اندازِ بیاں کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں۔ موصوف کا طویل تخلیقی سفر ہے۔ان کی انفرادیت اور ادبی عظمت کا اعتراف برِ صغیر ہندوپاک کے ادبی حلقوں میں کیا گیا ہے۔پروفیسر شمیم حنفی ایک مقام پر موصوف کا تعارف پیش کرتے ہوئے اس ضمن میں فرماتے ہیں کہ :

''ہمارے زمانے کی ادبی معاشرت پر جن لوگوں کا سایہ بہت گہرا اور بہت طویل ہے،ان میں انتظار حسین صاحب بھی ہیں'' [۴]

انتظار حسین کی تحریروں کو پڑھ کر مسرت کا ایک ریلا سا اٹھتا ہے جس کی بنا پر ان کے سنجیدہ قارئین کے پاؤں اکھڑ جاتے ہیں۔ان کی خود ساختہ صورت حال حقیقت سے بہت دور ہیں ۔اس طرح کی صورت حال تخیل کے حوالے سے یورپ میں سامنے آئی ۔موصوف کے یہاں یادِ ماضی ، کلاسیکیت سے محبت ، ماضی پرستی ، ماضی پر نوحہ خوانی اور روایت میں پناہ کی تلاش نظر آتی ہے۔پرانے اقدار کے بکھرنے اور نئے اقدار کے سطحی اور جذباتی ہونے کا دکھ اور اظہار کے ضمن میں بہت سے مقامات پر انداز اور لب ولہجہ ترش ہو جاتا ہے۔ان کے افسانوں اور ناولوں کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انھیں زندگی کی ظاہری بناوٹ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی ۔ان کا یہی منفرد جزبہ ان کے قلم سے ہوتا ہوا ان کی تخلیقات کی پہچان بنتا رہا۔ظاہرداری کے بجائے باطن میں آئے درپیش حالات پر ان کی نگاہ مرکوز تھی۔ یہی باطن کی غوطہ زنی، تحریکات ورجحانات کی جکڑ بندیوں سے بالاتر اور اسلوبیاتی تنوع انتظار حسین کی پہچان ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ماہنامہ انشاء،انشا پبلی کیشنز،کلکتہ،شمارہ نمبر(۱۲،۱۱) نومبر ۲۰۰۸ء (ص ۔ ۷،۶)

۲۔ [https;//Youtu.be/q5VPnzyCruk] Jashn e Adab فروری ۲۰۱۶ء

۳۔ انتظار حسین اوران کے افسانے، گوپی چند نارنگ، ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ، ۱۹۸۶ء، (ص ۔ ۵)

۴۔ [https;//youtu.be/yhPXjd-704k] ANJUMAN TARAQQI URDU HIND دسمبر ۲۰۱۸ء

ریسرچ اسکالر یونیورسٹی آف حیدرآباد

Mohdyassar47@gmail.com

DECLARATION

I, **MOHD. YASSAR, Reg. No. 20HUHL08** hereby declare that this dissertation entitled " Intizar Hussain Ke Novelon Mein Taqseem e Hind Ke Asarat aur Hijrat Ka Karb " submitted by me under the guidance and supervision of Dr Md. Zahidul Haque is a bonafide research work which is also free from plagiarism. I also declare that it has not been submitted previously in part or in full to this university or any other Institutions for award of any degree or diploma. I hereby agree that my thesis can be deposited in shodganga/INFLIBNET.

Date:

Signature of the Student
Name: Mohd. Yassar
Reg. No. 20HUHL08

UNIVERSITY OF HYDERABAD

CERTIFICATE

This is to certify that the Dissertation Entitled "Intizar Hussain Ke Novelon Mein Taqseem e Hind Ke Asarat aur Hijrat Ka Karb" submitted by **MOHD. YASSAR** bearing Registration Number 20HUHL08 in Partial fulfillment of the requirement for the award of Degree of Master of Philosophy in Urdu is a bonafide work carried out by him under my supervision and Guidance.

The said Dissertation has not been submitted previously in part or full to this or any other university or institution for the award of any degree or diploma.

Signature of the Supervisor

Counter Signature

Head of the Department

Dean
School of Humanities